رمضان
کیسے گزاریں
مولانا ندیم الواجدی
دارالکتاب دیوبند

رمضان کیسے گزاریں؟

مولانا ندیم الواجدی

دار الکتاب دیوبند

اشاعت کی عام اجازت ہے

نام کتاب : رمضان کیسے گزاریں

نام مصنف : مولانا ندیم الواجدی

طبع اول : ۱۴۳۱ھ/۲۰۱۰ء

صفحات : ۱۹۲

کمپیوٹر کتابت: مستقیم سالک قاسمی مدہوبنی محمد اختر قاسمی سیتاپوری

یاسر ندیم کمپیوٹر سینٹر دیوبند

مطبع : یاسر ندیم آفسٹ پریس دیوبند

ناشر : دار الکتاب دیوبند

کلام ربانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ.

(البقرۃ: ۱۸۵)

ترجمہ: رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن جو ہدایت ہے لوگوں کے لئے اور جس میں روشن دلائل ہیں ہدایت پانے اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کے لئے، سو جو شخص اس مہینے کو پائے تو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے۔

❁❁❁

فرمانِ رسالت

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

شهر رمضان كتب عليكم صيامه وسنت لكم قيامه فمن صامه ايمانا و احتسابا خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه.

(سنن ابن ماجة: ۱۱/ ۳۲۱، رقم الحديث: ۱۳۲۸)

ترجمہ: رمضان کا مہینہ وہ مہینہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے اور میں نے تمہارے لئے اس ماہ میں قیام کو مسنون قرار دیا ہے چنانچہ جو شخص ایمان و احتساب کی حالت میں اس مہینے کے روزے رکھے گا اور اس میں قیام کرے گا تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک و صاف ہو جائے گا جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو۔

❀❀❀

فہرست مضامین

پیش لفظ

رمضان کا مہینہ اپنی عظمت اور تقدس کے لحاظ سے کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، عبادتوں کا یہ مہینہ نیکیوں کا موسم بہار بھی ہے، جن بندگانِ خدا کو اللہ توفیق دیتا ہے وہ نیکیوں کے اس موسم بہار سے خوب لطف اٹھاتے ہیں، اور اپنا دامن مراد بھر لیتے ہیں، رات کے آخری حصے میں اٹھ کر سحری کھانا، فجر کی نماز باجماعت ادا کرنا، دن بھر روزے رکھنا، شام کو افطار کرنا، نماز تراویح پڑھنا، تہجد کا اہتمام کرنا اور قرآن کریم کی تلاوت کرنا یہ وہ عبادتیں ہین جو اس خاص مہینے میں خاص طور پر ادا کی جاتی ہیں، بہت سے لوگ اس مہینے کے آخری عشرے میں اعتکاف کی سنت بھی ادا کرتے ہیں، ہمارے اردو اخبارات ورسائل اس ماہ کے احترام میں اپنے صفحات رمضان کی فضیلتوں پر مشتمل مضامین کے لئے خاص کر دیتے ہیں، اس سال رمضان المبارک کی آمد سے پہلے مجھے خیال ہوا کہ اگر اخبارات میں ایک ایسا سلسلۂ مضامین شروع کیا جائے جس میں رمضان المبارک کی تمام عبادتوں کے فضائل واحکام اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہوں، تو اس سے قارئین کو ان شاء اللہ فائدہ پہنچے گا، چنانچہ میں نے اس سلسلے کی پہلی قسط لکھی اور روز نامہ "صحافت" دہلی کو بھیجدی، اخبار میں پہلی قسط چھپی اور پسند کی گئی اس کے بعد یہ سلسلہ پورے رمضان چلتا رہا، یہاں تک کہ انتیس قسطوں میں مضمون مکمل ہو گیا، الحمد للہ سلسلۂ مضامین میں رمضان کے تعلق سے سب

ہی چیزیں آگئیں اس کا اندازہ آپ فہرست مضامین سے لگا سکتے ہیں۔

رمضان المبارک کے اختتام پر عید آتی ہے، اس کے تعلق سے بھی کچھ مسائل وغیرہ لکھے گئے ہیں، عید الاضحیٰ پر بھی چند اقساط پر فضائل ومسائل اسی اخبار میں چھپے اس طرح رمضان اور عیدین پر خاصا مواد قارئین کے سامنے آگیا، اخبار کے بہت سے قارئین کی خواہش تھی کہ یہ مضامین کتابی شکل میں مرتب کر کے شائع کر دئے جائیں اب یہ کتاب اس امید کے ساتھ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے کہ اس سے رمضان المبارک کے مبارک ومسعود روز وشب زیادہ بہتر انداز میں گزارنے میں مدد ملے گی، اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہم سب کے لئے نافع اور مفید بنائے، واللہ هو الموفق.

ندیم الواجدی

مدیر ماہ نامہ "ترجمان دیوبند"

۲۵/جنوری ۲۰۱۰ء

رمضان کا مہینہ نیکیوں کا موسم بہار

رمضان کا مبارک ومسعود مہینہ شروع ہو چکا ہے، اللہ کے نیک بندوں کو پورے سال اس ماہ مقدس کا انتظار رہتا ہے اور جب یہ مہینہ انہیں مل جاتا ہے تو وہ اسے پا کر اس قدر خوش ہوتے ہیں جیسے انہیں کوئی متاع گم شدہ حاصل ہو گئی ہو، اس مہینے کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ماہ رجب کے آغاز سے ہی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کی آمد کا انتظار شروع فرما دیتے تھے اور اس تک پہنچنے کی دعا کیا کرتے تھے: اللّٰهُمّ بارک لنا فی رجب وشعبان وبلغنا رمضان (المعجم الأوسط: ۱۸۹/۴، رقم الحدیث: ۳۹۳۹، مجمع الزوائد: ۱۶۰/۲) ظاہر ہے جس چیز کا اس قدر بے تابی کے ساتھ انتظار ہوتا ہو جب وہ چیز حاصل ہوتی ہے تو جتنی بھی خوشی ہو کم ہے اور اس چیز کی جس قدر بھی حفاظت کی جائے ناکافی ہے، رمضان کا مہینہ گیارہ مہینوں کے طویل انتظار کے بعد آتا ہے اور اپنے جلو میں بے شمار فضیلتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے، بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس مہینے کی برکتوں اور فضیلتوں سے اپنے دل کا دامن بھر لیتے ہیں اور بڑے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو یہ مہینہ پا کر بھی کچھ نہیں پاتے اور محروم رہ جاتے ہیں اور اس حدیث پاک کا مصداق بنتے ہیں: فان الشقی من حرم فیه رحمة الله عزوجل (مسند الشامیین: ۲۷۱/۳، رقم الحدیث: ۲۲۳۸) "بدبخت

وہ شخص ہے جو اس ماہ مبارک میں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے"۔

اس مہینے کے بے شمار فضائل ہیں مختصراً اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا، یہ مہینہ اللہ کی اطاعت کا ہے، اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مغفرت کرتا ہے اور ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے، اس مہینے میں ایک رات ہے جسے شب قدر کہتے ہیں جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے، اس مہینے میں دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں اور ایک ایک عمل کا ثواب کئی کئی گنا بڑھ جاتا ہے، روایات میں ہے کہ (ایک مرتبہ) شعبان کی آخری تاریخ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا: اے لوگو تم ایک ایسے مہینے میں داخل ہونے والے ہو جس میں ایک ایسی رات ہے جو ایک مہینوں سے بڑھ کر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے دنوں کا روزہ فرض کیا ہے اور راتوں کی عبادت نفل قرار دی ہے، جو شخص اس مہینے میں کسی ایک عمل کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب چاہے گا وہ اس شخص کی طرح ہوگا جو دوسرے کسی مہینے میں فرض عمل کرے اور جو شخص فرض ادا کرے گا وہ ایسا ہوگا جیسے کوئی شخص دوسرے مہینوں میں ستر فرض ادا کرے، اے لوگو! یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر اور اس کا بدلہ جنت ہے، یہ لوگوں کے ساتھ غم گساری اور ہمدردی کا مہینہ ہے اس مہینے میں اہل ایمان کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے جو شخص اس ماہ مبارک میں کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرائے اس کے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، اسے جہنم سے آزادی کا پروانہ عطا کیا جاتا ہے اور روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کئے بغیر افطار کرانے والے کو بھی اسی قدر اجر و ثواب دیا جاتا ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس کا پہلا عشرہ رحمت، دوسرا عشرہ مغفرت اور تیسرا آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا ہے، جو شخص اس مہینے میں اپنے خادم (ملازم وغیرہ) کے کام میں کمی کردے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کردیتا ہے اور جہنم کی آگ سے محفوظ رکھتا ہے، اے لوگو! اس مہینے میں چار امور کی کثرت کیا کرو

کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ، استغفار، جنت کی طلب اور دوزخ کی آگ سے پناہ (البیہقی فی شعب الایمان ۳/۳۰۵، رقم الحدیث: ۳۶۰۸، صحیح ابن خزیمہ، ۳/۱۹۱، رقم الحدیث: ۱۸۸۷)

جس مہینے کے اس قدر فضائل ہیں وہ مہینہ کس طرح گزارا جائے، جس ماہ مبارک کے لیے دنیا بھر کے مسلمان سراپا اشتیاق رہتے ہوں اس کا استقبال کس طرح کیا جائے اور جس مہینے کو خدا کا مہینہ کہہ کر تمام مہینوں سے افضل قرار دیا گیا ہے اس کے روز و شب کس طرح گزارے جائیں، اس مضمون میں یہی بتلانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مہینے کی اہم ترین عبادت روزہ ہے، روزے کو عربی میں صوم کہتے ہیں جس کے معنی ہیں رُکنا، شریعت کی اصطلاح میں صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور ہم بستری کرنے سے رکنے کو صوم کہتے ہیں، اگر کسی نے صبح صادق کے بعد بھی کچھ کھالیا یا پی لیا اور سورج غروب ہونے سے ایک منٹ پہلے کچھ کھا پی لیا تو اس کا روزہ نہیں ہوا، اسی طرح نیت بھی ضروری ہے، نیت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی روزہ رکھنے کے ارادے سے مقررہ وقت میں کھانا، پینا چھوڑ دے، اگر کسی نے دل میں روزے کی نیت نہیں کی اور تمام دن بھوکا پیاسا رہا تب بھی اس کا روزہ نہیں ہوا (معارف القرآن: ۱/۴۴۲) روزہ فرض ہے اور ان عبادات میں سے ایک ہے جن کو اسلام کے بنیادی ارکان کہا جاتا ہے، رمضان کے تمام روزے رکھنا ہر مسلمان مرد عورت، عاقل، بالغ پر فرض ہیں، جو شخص کسی شرعی عذر کے بغیر روزے نہیں رکھے گا وہ سخت گنہ گار ہوگا، قرآن کریم میں ہے: **يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.** (البقرة: ۱۸۳) "اے ایمان والو تم پر روزے اس طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے والوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ" مفسرین نے آیت کا یہ مفہوم بیان کیا ہے کہ روزہ کوئی معمولی عبادت نہیں ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے

کہ سابقہ امتوں پر بھی روزے فرض تھے، شریعت مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اسے فرض قرار دیا گیا ہے، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **بنی الإسلام علی خمس شهادة ان لا اله إلا الله وان محمداً رسول الله وإقام الصلوة وإيتاء الزكاة والحج وصوم رمضان (صحيح البخاری: ۱۲/۱، رقم الحديث: ۸، صحيح المسلم ۴۵/۱، رقم الحديث: ۱۶، سنن الترمذی: ۵/۵ رقم الحديث: ۲۶۰۹)** "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج کرنا"۔ ایک روایت میں ان تمام عبادات کو یکساں طور پر فرض قرار دیا گیا ہے، ایسا نہیں کہ ان میں سے ایک یا دو یا تین عبادتیں ادا کر لی جائیں اور باقی چھوڑ دی جائیں، حضرت عمارہ بن حزمؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **اربع فرضهن الله فی الإسلام فمن جاء بثلاث لم يغنين عنه شيأ حتى يأتی بهن جميعا الصلوة والزكوة وصيام رمضان وحج البيت (مسند احمد بن حنبل: ۲۰۰/۴، رقم الحديث: ۱۷۸۲۴ كنز العمال: ۳۳/۱، مجمع الزوائد، ۱۳۸/۱)** "چار عبادتیں اللہ نے اسلام میں فرض کی ہیں جو شخص ان میں سے تین کو ادا کرے تو وہ اس کو (مکمل طور پر) نفع نہ دیں گی جب تک سب کو ادا نہ کرے نماز، زکوۃ، رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج"۔

روزے کی عبادت کے بڑے فضائل ہیں، اس سلسلے میں صرف ایک حدیث کافی ہے جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **إن ربكم يقول كل حسنة بعشر امثالها إلى سبع مائة ضعف والصوم لی وانا اجزی به، الصوم جنة من النار، ولخلوف فم الصائم**

اطيب عند الله من ريح المسك، وإن جهل على احدكم جاهل وهو صائم فليقل إنی صائم (سنن الترمذی: ۱۳۶/۳، ۷۶۴، كنز العمال: ۴۴۸/۸، رقم الحديث: ۲۳۵۸۸) "تمہارا رب کہتا ہے کہ (اس ماہ میں) ایک نیکی کا اجر دس گنا سے سات سو گنا تک ہے اور روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا، روزہ دوزخ سے ڈھال ہے، روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پاکیزہ ہے، اگر تم میں سے کسی روزہ دار کے ساتھ کوئی جاہل الجھ پڑے تو اسے جواب میں کہہ دینا چاہئے میں روزے سے ہوں"۔ اس حدیث میں اللہ نے روزے کو اپنے لیے مخصوص قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کی جزا میں خود دوں گا، حالاں کہ تمام عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہوتی ہیں اور اللہ ہی سب کا اجر دینے والا ہے، اس سلسلے میں محدثین نے لکھا ہے کہ عام طور پر دوسری عبادتوں میں ریا کاری اور نمود و نمائش کا احتمال رہتا ہے، صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جو نظر نہیں آتی، کیوں کہ روزہ کھانا، پینا ترک کرنے کا نام ہے، یہ کوئی ایسی عبادت نہیں ہے جس میں کچھ وجودی اور ظاہری حرکات و سکنات ہوں، صرف وہی شخص روزہ رکھتا ہے جسے اللہ کا خوف ہو، بعض لوگ روزہ نہیں رکھتے لیکن وہ سب کے سامنے کھاتے پیتے بھی نہیں، اس سے دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی روزے سے ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جو آدمی محض اللہ کی رضا و خوش نودی کے لئے کرتا ہے اور اس کا مقصد حصول اجر و ثواب کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جب روزہ صرف اللہ کے لیے ہے تو اس کا اجر بھی اللہ تعالیٰ خود ہی عطا کرے گا، جو دوسری عبادتوں کے مقابلے میں ارفع و اعلا ہوگا (مرقاۃ شرح المشکوۃ)

روزے کے بعد اس مہینے کی اہم ترین عبادت نماز تراویح ہے اس نماز کی بھی بڑی فضیلت ہے، بے شمار روایات میں روزے اور نماز تراویح کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے مثال

کے طور پر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **شهر رمضان شهر كتب عليكم صيامه وسننت لكم قيامه فمن صامه وقامه ايمانا واحتسابا خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه** (ابن ماجة: ۱/۴۲۱، رقم الحدیث: ۱۳۲۸) "رمضان کا مہینہ ایسا مہینہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے تم پر اس کے روزے فرض کئے ہیں اور میں نے تمہارے لیے اس ماہ میں قیام کو مسنون قرار دیا ہے، چناں چہ جو شخص ایمان واحتساب کی حالت میں اس مہینے کے روزے رکھے گا اور اس میں قیام کرے گا تو وہ گناہوں سے اس طرح پاک وصاف ہو جائے گا جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو"۔

اس حدیث میں سنت کا لفظ آیا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ تراویح صرف مسنون عمل ہے کوئی شخص پڑھے یا نہ پڑھے، فقہائے کرام نے اس کی تصریح فرمادی ہے کہ سنت سے یہاں مراد سنت مؤکدہ ہے، اس کی بیس رکعتیں ہیں اور یہ بیس رکعات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، چنانچہ صحابۂ کرامؓ تابعینؒ، تبع تابعینؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور ایک قول کے مطابق امام مالکؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ تراویح کی بیس رکعات ہیں، چودہ سو سال سے آج تک اسی پر عمل ہوتا رہا ہے، حرمین شریفین میں بھی بیس رکعات پڑھنے کا معمول ہے، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں بیس رکعات اور وتر پڑھا کرتے تھے (مصنف ابن أبي شیبہ: ۲/۱۶۳، رقم الحدیث: ۷۶۸۰، سنن البیہقی: ۲/۴۹۶، رقم الحدیث: ۴۳۹۱ المعجم الکبیر: ۱۱/۳۹۳، رقم الحدیث: ۱۲۱۰۲)

خلفائے راشدین کے عہد میمون میں بھی بیس رکعات کا ہی معمول رہا جیسا کہ یزید بن رومانؓ کی روایت میں ہے کہ لوگ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں رمضان میں

بیس رکعات (تراویح) اور تین (رکعت) وتر پڑھا کرتے تھے (مؤطا امام مالکؒ ص: ۴۰)

بہرحال رمضان المبارک کے پورے مہینے میں روزآنہ بیس رکعت تراویح مرد وعورت دونوں کے لیے سنت مؤکدہ ہے، بلا عذر تراویح چھوڑنے والا یا بیس رکعات سے کم پڑھنے والا گنہ گار ہوگا، تراویح کی دو دو رکعتیں ایک سلام سے ادا کی جائیں، اگرچہ چار رکعتیں بھی پڑھی جاسکتی ہیں، تراویح میں ایک مرتبہ مکمل قرآن کریم پڑھنا یا سننا بھی سنت ہے، مردوں کے لیے تراویح باجماعت مسنون ہے، خواتین بلا جماعت گھر کے اندر تراویح کی نماز ادا کریں۔ (فتاوی رحیمیہ ج: ۶/ تراویح کے مسائل)

اس ماہ مبارک کی تیسری اہم عبادت تلاوت قرآن ہے، یوں تو قرآن کریم کی تلاوت کا معمول سال کے بارہ مہینے رہنا چاہئے، لیکن رمضان المبارک میں اگر تلاوت کی کثرت ہو تو یہ اجر وثواب کے لحاظ سے بھی بہتر ہے اور اس لیے بھی اس کی فضیلت ہے کہ رمضان المبارک کا مہینہ نزول قرآن کا مہینہ ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (البقرة: ۱۸۵) "رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم نازل کیا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، اور ہدایت کے باب میں نہایت واضح ہے اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا ہے" مفسرین نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ تمام آسمانی کتابیں اسی ماہ مبارک میں نازل ہوئی ہیں، حضرت قتادہؓ صحابی رسول حضرت واثلہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: صحف ابراہیم علیہ السلام رمضان کی پہلی تاریخ میں، تورات رمضان کی چھٹی تاریخ میں، زبور بارھویں تاریخ میں، انجیل اٹھارھویں تاریخ میں اور قرآن کریم چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد پچیسویں تاریخ میں نازل ہوا، نزول قرآن کی تاریخ میں دوسرے قول بھی ہیں، تاہم اتنا نص قرآن سے ثابت ہے کہ اس کا نزول شب قدر میں

ہوا (مسند احمد بن حنبل: ۳/۱۰۷، رقم الحدیث: ۱۷۰۲۵، معارف القرآن: ۷/۷۵۷)
حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ”قرآن کو شروع ہی سے رمضان سے خصوصیت ہے، آیت: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْآنُ سے خصوصیت باعتبار نزول کے ثابت ہوئی، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام سے قرآن کریم کا دور رمضان ہی میں کیا کرتے تھے، نیز فقہاء نے لکھا ہے کہ رمضان میں ایک قرآن ختم کرنا تراویح میں مسنون ہے، نیز ان تمام نصوص سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت رمضان میں زیادہ مطلوب ہے، یہ خصوصیت تو تشریعی ہے، تکوینی خصوصیت یہ ہے کہ اس ماہ میں ہر شخص خود بہ خود قرآن کی طرف راغب ہو جاتا ہے اس لیے میں ذاکرین کے واسطے بھی اس ماہ میں تلاوت قرآن کو ذکر سے افضل سمجھتا ہوں، میرا یہ مطلب نہیں کہ ذکر نہ کریں وہ بھی کریں مگر زیادہ قرآن کی تلاوت کریں، کیوں کہ ذکر نو بارہ مہینے یکساں ہے اور رمضان میں قرآن پڑھنے میں خاص برکات نازل ہوتی ہیں، جس طرح مکہ میں جا کر طواف بہ کثرت کرنا چاہئے اور عبادات کو بھی کرنا چاہئے مگر طواف سب سے زیادہ کرنا چاہئے، اسی طرح رمضان میں قرآن کی تلاوت ہے (خطبات حکیم الامت: ۱۶/۱۲۱)

ان عبادات واعمال کے علاوہ بھی کچھ ایسے عمل ہیں جن کو اس مہینے کے اندر اپنے معمولات میں شامل کر لینا چاہئے، کیوں کہ یہ مہینہ نیکیوں کا موسم بہار ہے، جتنی نیکیاں بھی کمالی جائیں کم ہے، یوں بھی ایک ایک نیکی پر سات سو گنا تک ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے پھر کیوں نہ نوافل سے، ذکر واذکار سے، صدقہ وخیرات سے، اس مہینے کے ایک ایک لمحے کو قیمتی بنایا جائے، اس مہینے میں دعائیں بھی قبول ہوتی ہیں، اس لیے بندۂ مومن کو چاہئے کہ وہ اس موقع کو ضائع نہ ہونے دے اور جتنا بھی اپنے رب کریم وجلیل سے مانگ سکے مانگ لے، معلوم نہیں آئندہ سال یہ موسم بہار ہماری زندگی میں آئے گا یا نہیں۔

رمضان کا مہینہ - ایک قابل غور پہلو

رمضان کا مہینہ کس قدر بابرکت ہے اس کا اندازہ کرنا ہو تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ ملاحظہ کیجئے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان کی آخری تاریخ کو ارشاد فرمایا: حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ شعبان کے آخری دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے اوپر ایک عظیم اور بابرکت مہینہ سایہ فگن ہونے والا ہے، اس مہینے کی ایک رات ہزار مہینوں سے افضل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام کو نفلی عبادت قرار دیا ہے، جو شخص اس مہینے میں نفلی عبادت کے ذریعے تقرب الٰہی کا طلب گار ہوگا اس کو رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں کے فرض کے برابر ثواب ملے گا اور جو شخص اس مہینے میں فرض عبادت ادا کرے گا اس کو دوسرے دنوں کی ستر فرض عبادتوں کا ثواب ملے گا، یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے یہ ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، یہ ایسا مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھا دیا جاتا ہے، جو شخص اس مہینے میں کسی کو روزہ افطار کرائے گا اس کا یہ عمل اس کے گناہوں کی مغفرت کا سبب اور دوزخ کی آگ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزے دار کے ثواب میں کمی کئے بغیر روزے دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص کے اندر افطار کرانے کی گنجائش نہیں ہوتی

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی یہ ثواب عطا فرمائے گا جو کسی روزہ دار کو ایک کھجور، پانی کے ایک گھونٹ یا تھوڑی سی لسی سے افطار کرا دے۔ یہ ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ دوزخ سے نجات ہے جو شخص اس مہینے میں اپنے غلام (ملازم، خادم) کے کام میں کمی کرے گا اللہ اس کی مغفرت فرمائے گا اور اسے دوزخ سے آزادی عطا کرے گا (البیہقی فی شعب الایمان ۳/۳۰۵، رقم الحدیث: ۳۶۰۸، صحیح ابن خزیمہ ۳/۱۹۱، رقم الحدیث: ۱۸۸۷)

حدیث لمبی ہے، ہم نے یہاں مختصراً نقل کی ہے، یہ ایک جامع خطبہ ہے اور اس میں گویا رمضان کی تمام خصوصیات بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس مہینے میں کئے جانے والے تمام اعمال کا خلاصہ آ گیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں تک رمضان کے روزوں کی فضیلت کا معاملہ ہے ہر مسلمان اس سے اچھی طرح واقف ہے، لیکن اس حدیث میں رمضان کی کچھ اور خصوصیتوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، سب سے پہلے تو اس مہینے کو رمضان کا مہینہ کہہ کر اس کی عبادتوں کا ذکر کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ کس طرح کی عبادتوں پر کس طرح کا اجر ہے، پھر اسے ماہ صبر قرار دیا گیا ہے، صبر صرف یہی نہیں ہے کہ انسان بھوک پیاس کے باوجود کھانے پینے سے رکا رہے بلکہ صبر یہ بھی ہے کہ دوسروں کی اذیتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے، طبیعت کے تقاضے کے باوجود کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے کسی کو تکلیف پہنچے، کان، آنکھ، زبان تمام اعضاء کو ایسے کاموں سے روکے جن میں اگرچہ بڑا مزہ ہے، بڑی لذت ہے مگر وہ اللہ کو پسند نہیں ہیں، یہی صبر ہے اور اسی پر جنت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس مہینے کو ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ بھی قرار دیا گیا ہے اور اس میں مومن کے رزق میں برکت بھی دے دی جاتی ہے، حدیث شریف میں مواسات کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی سے پیش آنا اور ایک دوسرے کی غم خواری کرنا، ہم مواسات کس طرح

کریں، مذکورہ بالا حدیث میں اس کی دو مثالیں اور دو کیفیتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں ایک تو یہ کہ ہم خود ہی روزہ افطار نہ کریں بلکہ ہو سکے تو دوسروں کو بھی افطار کرا دیں، اگر گنجائش ہو تو اپنی وسعت اور ہمت کے مطابق جو کچھ میسر ہو روزہ دار کی ضیافت کے لیے پیش کر دیں اور گنجائش نہ ہو تو کھجور سے ہی افطار کرا دیں، اس کی ہمت نہ ہو تو لسی کے چند گھونٹ ہی پلا دیں، یہ بھی ممکن نہ ہو تو پانی سے افطار کرا دیں، حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خود تو طرح طرح کی نعمتوں سے روزہ افطار کریں اور جو لوگ ضرورت مند ہیں ان کو ایک کھجور کھلا کر اور ایک گلاس پانی پلا کر یہ سوچیں کہ ہم نے روزہ افطار کرا کے بڑا ثواب کما لیا ہے، دوسرا سبق یہ دیا گیا ہے کہ اپنے ماتحتوں سے ملازموں اور نوکروں سے عام دنوں کے مقابلے میں کام کم لیں آخر وہ بھی روزے سے ہیں، روزے کی حالت میں ہمتیں جواب دے جاتی ہیں، بھوک پیاس کے احساس کے ساتھ کام سے طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے، اگر ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور ان کی مفوضہ ذمہ داریوں میں تخفیف کر دی جائے تو یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے مومن کے رزق میں اضافے کی مصلحت بھی یہی ہو سکتی ہے کہ وہ خود بھی کھائے اپنے اہل وعیال کے لیے بھی دسترخوان کو وسعت دے اور ضرورت مند رشتہ داروں دوستوں اور پڑوسیوں کا بھی خیال رکھے، چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ تمہارے پاس رمضان کا مہینہ آ چکا ہے تم اس کے لیے نیت پہلے ہی سے درست کر لو اور اس مہینے میں (اپنے اور اپنے اہل وعیال کے) نان نفقے میں فراخی کرو (کنز العمال: ۸/۴۶۶ رقم الحدیث: ۲۳۶۸۹) ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ رمضان کے مہینے میں نان نفقے کے متعلق وسعت سے کام لو کیوں کہ اس مہینے میں (اپنی ذات پر اور اہل وعیال پر) خرچ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا (الجامع الصغیر)۔

رمضان کو مواسات، ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ قرار دینا اپنے آپ میں ایک

وسیع مفہوم رکھتا ہے روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینے میں قیدیوں کو چھوڑ دیا کرتے تھے اور ہر مانگنے والے کو دیا کرتے تھے (بیہقی شعب الایمان) حضرت عبداللہ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ سخی تھے اور رمضان المبارک میں جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ سے ملاقات کرتے تھے تو آپ اور زیادہ سخی اور فیاض ہو جاتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھلائی اور خیر کے کاموں میں تیز ہوا سے بھی زیادہ فیاضی اور سخاوت فرماتے تھے (بخاری:۱/۶، رقم الحدیث:۶، مسلم:۴/۱۸۰۳، رقم الحدیث:۲۳۰۸)

ہم میں سے بہت سے لوگ رمضان کے اس پہلو سے واقف ہی نہیں ہیں کہ یہ ہمدردی کا مہینہ ہے، ہم روزے بھی رکھتے ہیں، نمازیں بھی پڑھتے ہیں، تراویح کی نماز بھی مستعدی کے ساتھ ادا کرتے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن اس مہینے کا جو پیغام ہے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، یقیناً یہ تمام کام اجر وثواب کے ہیں اور ایک ایک عمل پر ہمیں ستر ستر گنا ثواب ملنے والا ہے، لیکن یہ ثواب تو صرف ہمیں ملے گا، ہمارے ذریعے دوسروں کو اس ماہ مبارک میں کتنا فائدہ پہنچا، ہم نے رمضان کی مقدس ساعتوں میں کبھی اس سوال پر غور نہیں کیا؟ اس مہینے میں اللہ کی رحمتوں کی وجہ سے اور عبادتوں کے تسلسل کے باعث ہمارے دلوں میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے، طبیعت خیر کے کاموں کی طرف مائل ہونے لگتی ہے، ہمیں اپنے دلوں کی اس نرمی اور خیر کی طرف طبیعتوں کے اس میلان سے اس ماہ مقدس میں پورا فائدہ اٹھانا چاہئے، اور فائدہ اٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں ہمارے عزیز واقارب میں، اپنے حلقۂ تعارف میں اور پاس پڑوس کے مکانوں میں کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو اپنی کم آمدنی کے باعث اس مہینے کی ظاہری نعمتوں سے مستفید نہیں ہو سکتے، کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ ہمارے دسترخوان پر طرح طرح کی نعمتیں سجی

ہوئی ہوں اور انواع واقسام کے کھانے رکھے ہوئے ہوں دوسری طرف ہمارے قریب کے کچھ لوگ نانِ جویں کو بھی محتاج ہوں یا روکھا سوکھا کھا کر پیٹ بھر رہے ہوں، عید سر پر ہے ہماری ذمہ داری ہے کہ عید کی مسرتوں میں ان لوگوں کو بھی شریک کرلیں جو اپنی تنگ دستی کے سبب اس دن بھی روز کی طرح نظر آنے والے ہیں ماہ رمضان کو ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ بلا وجہ قرار نہیں دیا گیا، اس میں صاحب حیثیت مسلمانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ضرورت مند انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور غم خواری بھی اس ماہِ مبارک کی ایسی ہی عبادت ہے جس پر ستر گنا اجر وثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ کیا ہم یہ ثواب کمانے کے لیے تیار ہیں؟

رمضان المبارک کس طرح گزاریں؟

ماہِ رمضان کی فضیلت:

رمضان اسلامی سال کے مہینوں کی ترتیب کے لحاظ سے نواں مہینہ ہے، اس کا نام بڑے احترام وادب کے ساتھ لیا جاتا ہے، اس مہینے کے بڑے فضائل ہیں، اس میں قرآن کریم نازل ہوا، یہ مہینہ اللہ کی عبادت، اطاعت، نیکی، اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور غم گساری کا مہینہ ہے، یہ مہینہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کا مہینہ ہے اس مہینے میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے، اسے شب قدر کہتے ہیں، حدیث شریف میں ہے رمضان تمام مہینوں کا سردار ہے اور جمعہ تمام دنوں کا (طبرانی کبیر) رمضان کا مہینہ بڑا بابرکت ہے، اگر اس کی صحیح قدر کی جائے اور اس کے تمام حقوق ادا کیے جائیں تو یہ مہینہ پورے سال کے صغیرہ گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور اس ایک مہینے کی عبادت کی وجہ سے آنے والے تمام مہینوں کی معمولی اور چھوٹی موٹی خطائیں معاف کردی جاتی ہیں، ایک حدیث میں ہے: ایک رمضان دوسرے رمضان تک گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے بہ شرط یہ کہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے (کنز العمال: ۸/۴۶۶) سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ماہ مبارک کی صحیح قدر و قیمت کا احساس تھا، اس کا اندازہ ان دعاؤں سے لگایا جا سکتا ہے جو آپ شعبان کے مہینے میں یا رمضان کا چاند دیکھ کر فرمایا کرتے تھے: حضرت عبادہ ابن الصامتؓ روایت

کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں رمضان کی آمد پر یہ دُعا کرنے کی تعلیم دیتے تھے: **اَللّٰھُمَّ سَلِّمْنِی لِرَمَضَانَ وَرَمَضَانَ لِیَ وَسَلِّمْہُ لِی مُتَقَبَّلاً** (کنز العمال: ۸/۵۸۴) ''اے اللہ مجھے رمضان کے لیے اور رمضان کو میرے لیے صحیح سلامت رکھئے اور رمضان کو میرے لیے سلامتی کے ساتھ قبولیت کا ذریعہ بنا دیجئے''۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کی آمد کے موقع پر ارشاد فرمایا: ''تمہارے پاس رمضان کا مہینہ جو برکت کا مہینہ ہے آچکا ہے، یہ مہینہ سراپا خیر ہے، اس مہینے میں اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمتوں کی چادر تان دیتا ہے، تمہارے گناہ معاف کردیتا ہے، تمہاری دعائیں قبول کرتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ تم اس مہینے میں کتنی نیکیاں کرتے ہو اور کس طرح ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہو، پھر وہ تمہارے نیک اعمال پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے، لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کے سامنے نیک اور اچھے اعمال پیش کرو، بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جو اس مہینے میں اللہ کی رحمت سے محروم رہے'' (کنز العمال: ۸/۴۶۷، رقم الحدیث: ۲۳۶۹۲)

روزے کی اہمیت اور فرضیت:

رمضان المبارک میں سب سے بڑی اور اہم ترین عبادت روزہ ہے، شریعت کی اصطلاح میں روزہ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص روزے کی نیت سے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک مسلسل کھانے پینے اور جماع کرنے سے رُکا رہے، اگر کسی نے روزے کی نیت نہیں کی اور پورے دن بھوکا پیاسا رہا تو اس کا روزہ نہیں ہوا، اسی طرح اگر کسی نے صبح صادق کے بعد کچھ کھا پی لیا، یا سورج غروب ہونے سے ایک منٹ پہلے کچھ کھا پی لیا تو یہ روزہ بھی نہیں ہوگا، نیت کے لیے زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے بلکہ دل میں قصد وارادہ ہونا کافی ہے (معارف القرآن: ۱/۴۴۲)

رمضان المبارک کا روزہ ان عبادات میں سے ہے جن کو اسلام کی بنیاد اور ستون

قرار دیا گیا ہے، یہ بدنی عبادت ہے اور فرض عین ہے، فرض عین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر مکلف شخص اس کی ادائیگی کا پابند ہے، ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ ادا کریں گے تو باقی تمام لوگوں کے ذمے سے ادا ہو جائے گا، رمضان المبارک کے تمام روزے رکھنا ہر مسلمان مرد عورت عاقل بالغ پر فرض ہے، اس کا انکار کرنے والا مسلمان نہیں ہے اور کسی شرعی عذر اور مجبوری کے بغیر روزے چھوڑنے والا سخت گنہگار ہے (عمدۃ الفقہ: ۳/۱۲۳)

روزے کی فضیلت:

اسلام میں روزے کے بے شمار فضائل ہیں، ایک روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا روزہ دوزخ سے ڈھال ہے اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے یہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہے"۔ (ترمذی: ۳/۱۳۶، رقم الحدیث: ۷۶۴)

ایک حدیث میں ہے کہ "جنت کا ایک دروازہ ہے جسے ریان کہا جاتا ہے، اس دروازے سے قیامت کے دن صرف روزہ رکھنے والے ہی داخل ہوں گے، جب روزہ دار اس دروازے سے داخل ہو جائیں گے تو اسے بند کر دیا جائے گا، پھر کوئی شخص داخل نہیں ہوگا" (مسلم: ۲/۸۰۸، رقم الحدیث: ۱۱۵۲، نسائی: ۴/۱۶۸، رقم الحدیث: ۲۲۳۷، ترمذی: ۳/۱۳۷، رقم الحدیث ۷۶۵) ایک حدیث میں ہے کہ "جس نے رمضان کے روزے رکھے اور ان کی حدود کو پہچانا اور ان چیزوں کی حفاظت کی جن چیزوں کی حفاظت روزوں کے لیے ضروری تھی تو یہ روزے اس کے (صغیرہ) گناہوں کا کفارہ ہو جائیں گے۔ (ابن حبان: ۸/۲۱۹، رقم الحدیث: ۳۴۳۳، بیہقی: ۴/۳۰۴، رقم الحدیث: ۸۲۸۸)

رمضان کا ایک روزہ:

بعض صحت مند، تن درست لوگ بھی بغیر کسی وجہ کے روزہ چھوڑ دیتے ہیں

حالاں کہ یہ روزہ کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ ان لوگوں کو نہیں ہے، معمولی بھوک بیڑی، سگریٹ، پان، تمباکو، چائے وغیرہ کی لت اور بڑی سے بڑی مصروفیت اس کے لیے چھوڑی جا سکتی ہے، کیوں کہ اگر رمضان کا ایک روزہ چھوٹ گیا تو تمام عمر اس کی تلافی نہیں ہو سکتی، حدیث شریف میں ہے: **من افطر یوماً من رمضان من غیر رخصة ولا مرض لم یقضه صوم الدهر کله وان صامه** (ترمذی: ۳/۱۰۱ رقم الحدیث: ۷۲۳، ابوداؤد: ۱/۷۲۹، رقم الحدیث: ۲۳۹۶ ابن ماجة: ۱/۵۳۴، رقم الحدیث: ۱۶۷۱) "جس شخص نے رمضان کا ایک روزہ بھی کسی عذر یا مرض کے بغیر چھوڑ دیا اس کی تلافی نہیں ہے اگر چہ اس کے عوض تمام عمر روزے کیوں نہ رکھے"۔ اس حدیث کو سامنے رکھ کر وہ لوگ غور کریں جو بلا کسی عذر کے روزہ نہیں رکھتے۔

روزے کی نیت کے متعلق کچھ مسائل:

(۱) روزے کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نیت کی جائے، نیت کے لیے زبان سے اظہار کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ دل میں نیت کر لینا کافی ہے (فتاوی ہندیہ: ۱/۱۹۴)

(۲) رمضان میں ہر روزے کی نیت کرنا ضروری ہے، تمام روزوں کے لیے ایک مرتبہ کی نیت کافی نہیں ہوگی۔ (علم الفقہ: ۴۲۱)

(۳) روزے کے لیے سحری کھانا بھی نیت کے قائم مقام ہے، البتہ اگر کسی نے سحری کھائی اور دل میں روزہ نہ رکھنے کا خیال رہا تب یہ سحری نیت کے قائم مقام نہ ہوگی (علم الفقہ: ۴۲۲)

(۴) رمضان کے روزے کی اگر رات سے نیت کرے تب بھی کافی ہے، اگر کسی نے رات کو روزہ نہ رکھنے کا ارادہ کیا اور صبح تک یہی ارادہ رہا، پھر دوپہر سے

پہلے پہلے یہ خیال ہوا کہ روزہ رکھ لینا چاہئے تو اگر کچھ کھایا پیا نہیں تو روزہ صحیح ہوگا
(احسن الفتاوی: ۴/۴۳۷)

(۵) نیت کرنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ زبان سے یہ دعا کہہ لی جائے:
بِصَوْمِ غَدٍ نَوَيْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ۔ اس طرح نیت کرنے کا بڑا ثواب ہے۔

(۶) اگر کسی نے زوال سے پہلے تک نیت نہیں کی تو اس کا روزہ صحیح نہیں ہوا لیکن رمضان المبارک کے احترام کی وجہ سے کھانا پینا جائز نہیں ہے، تاہم اس روزے کی صرف قضاء لازم آئے گی (امداد الفتاوی: ۱/۱۷۳)

(۷) لیکن اگر رات سے روزے کی نیت تھی، یا زوال سے پہلے پہلے نیت کرلی تھی، اس کے بعد کچھ کھا پی لیا تو روزہ ختم ہوجائے گا اور اس کی قضاء اور کفارہ دونوں لازم آئیں گے (حوالہ سابق)

(۸) نیت سے دل کا ارادہ مراد ہے، اگر کوئی شخص دل میں یہ نیت کر کے سوگیا کہ میں کل روزہ رکھوں گا تو صبح اٹھ کر اس کے لیے از سر نو نیت کرنا ضروری نہیں ہے
(فتاوی دار العلوم: ۶/۴۴۴)

(۹) نیت کرنے کے بعد بھی صبح صادق تک کھانے پینے کی اجازت ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ نیت کرتے ہی کھانا پینا بند کر دیا جائے، بلکہ روزہ دار اس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک وقت میں گنجائش ہے۔

(۱۰) صبح صادق اور غروب آفتاب کا وقت معلوم کرنے کے لیے معتبر، مستند اور قابل اعتماد اداروں سے شائع شدہ ٹائم ٹیبل حاصل کئے جائیں اور اپنی گھڑیوں میں صحیح وقت کرلیا جائے، بے احتیاطی سے روزے خراب ہوسکتے ہیں۔

سحری:

لغت میں سحری اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح صادق سے پہلے کھایا جائے۔

یہ اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے روزہ داروں کے لیے سحری کھانے میں بھی بڑی فضیلت رکھ دی ہے، اگر یہ فضیلت نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا کہ اللہ کے بہت سے بندے بغیر سحری کا روزہ رکھ کر مشقت اٹھاتے، سحری کھانا سنت ہے، بہت سی روایات میں سحری کی فضیلت وارد ہے، شارح بخاری علامہ عینیؒ نے اپنی کتاب عمدۃ القاری میں لکھا ہے کہ سترہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے سحری کی فضیلت میں احادیث مروی ہیں اور اس کے مستحب ومسنون ہونے پر علماء کا اجماع ہے، شارح مسلم امام نوویؒ نے بھی سحری کی فضیلت اور استحباب پر فقہاء امت کا اجماع نقل کیا ہے (المجموع شرح المهذب: ج۶، باب :لسحور فی الصوم) اس سلسلے کی کچھ احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تسحروا فإن فی السحور بركة۔ "سحری کھایا کرو اس لیے کہ سحری کے کھانے میں برکت ہے" (بخاری: ۲/۶۷۸، رقم الحدیث: ۱۸۲۳، مسلم: ۲/۰۷۷، رقم الحدیث: ۱۰۹۵، ترمذی: ۳/۸۸، رقم الحدیث: ۷۰۸) (۲) حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سحری مبارک کھانا ہے (صحیح ابن حبان: ۸/۲۴۳، رقم الحدیث: ۳۴۶۴) (۳) حضرت عبداللہ بن حرثؓ فرماتے ہیں کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اس وقت سحری تناول فرما رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ برکت کی چیز ہے، اللہ تعالی نے یہ خاص چیز تمہیں عطا فرمائی ہے، لہذا اسے مت چھوڑنا (نسائی: ۴/۱۴۵، رقم الحدیث: ۲۱۶۲) (۴) حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سحری کا کھانا باعث برکت ہے اسے مت چھوڑو خواہ ایک گھونٹ پانی ہی پی لیا کرو، کیوں کہ سحری کھانے والوں پر اللہ

رحمتیں بھیجتا ہے اور فرشتے رحمت کی دُعا کرتے ہیں، (مسند احمد بن حنبل: ۱۲/۳، رقم الحدیث: ۱۱۱۰۱) (۵) حضرت عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے اور اہل کتاب کے روزوں کے درمیان سحری کا فرق ہے (یعنی وہ سحری نہیں کھاتے ہم کھاتے ہیں) (صحیح مسلم: ۲/۷۷۰ رقم الحدیث: ۱۰۹۶) (۶) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سحری کے کھانے سے دن کے روزے پر قوت حاصل کرو اور قیلولے (دوپہر کے آرام) سے رات کے قیام (تہجد) میں مدد لو (ابن ماجہ: ۱/۵۴۰، رقم الحدیث: ۱۶۹۳)

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سحری کھانا باعث اجر و ثواب بھی ہے اور اس سے روزے پر قوت بھی حاصل ہوتی ہے، بعض لوگ تراویح کے بعد سو جاتے ہیں اور سستی کی وجہ سے سحری کے لیے نہیں اٹھتے، ان کا روزہ تو ہو جاتا ہے مگر وہ سحری کے ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سحری میں تاخیر کرنی چاہئے:

سحری کچھ تاخیر سے کھانی چاہئے، لیکن اتنی تاخیر بھی نہ کرنی چاہئے کہ صبح صادق طلوع ہو جائے، صبح صادق کی پہچان یہ ہے کہ مشرق میں افق کے کناروں پر روشنی کی دھاری نمودار ہوتی ہے، پھر روشنی غالب آجاتی ہے اور تاریکی ختم ہو جاتی ہے سحری کی تاخیر سے متعلق ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں نبوت کا حصہ ہیں (۱) افطار میں عجلت (۲) سحری میں تاخیر (۳) اور نماز میں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھنا (سنن دار قطنی: ۱/۲۸۴ رقم الحدیث: ۲......) سحری میں کتنی تاخیر ہونی چاہئے اس کا ذکر بھی حدیث میں موجود ہے: حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ سحری کھائی آپ نماز کے لیے کھڑے ہوئے (راوی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت زید بن ثابتؓ سے دریافت کیا) کہ اذان اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ ہوتا تھا، انہوں نے کہا تقریباً پچاس آیات کی تلاوت کا۔ (بخاری: ۲/۶۷۸، رقم الحدیث ۱۸۲۱)

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح صادق سے اتنی دیر پہلے سحری ختم کر دینی چاہئے کہ اتنی مدت میں قرآن کریم کی کم از کم پچاس آیات تلاوت کی جا سکیں۔

سحری کے کچھ اور مسائل:

(۱) سحری کھانا مستحب ہے، اگر کسی نے بغیر سحری کے روزہ رکھ لیا تو روزہ ہو جاتا ہے، اگر رات کو آنکھ نہ کھلی اور سحری رہ گئی تو روزہ رکھنا چاہئے، سحری نہ کھانے کی وجہ سے روزہ چھوڑ دینا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/۱۵۶)

(۲) صبح صادق کے بعد کھانا پینا درست نہیں ہے، بعض لوگ اذان کا انتظار کرتے رہتے ہیں، اذان کا انتظار کرنا غلط ہے ہو سکتا ہے، اذان صبح صادق کے بعد تاخیر سے دی جا رہی ہو (فتاوی دار العلوم: ۶/۳۴۵) چنانچہ اگر اذان شروع ہوتے ہی سحری چھوڑ دی تو اگر یہ یقین ہو کہ صبح صادق کے بعد اذان ہوتی ہے تب تو روزہ صحیح نہیں ہوگا اور اگر محض شبہ ہو یقین نہ ہو تو اگرچہ ایسے تنگ وقت میں کھانا مکروہ ہے مگر روزہ ہو جائے گا (احسن الفتاوی: ۴/۴۳۲)

(۳) سحری کھانے کے بعد کلی کر لینی چاہئے، بلکہ مسواک وغیرہ کر لینی چاہئے اور دانت منہ اچھی طرح صاف کر لینے چاہئیں تا کہ کھانے کے ریزے وغیرہ دانتوں میں اٹکے نہ رہیں، اگر کسی نے سحری کھا کر کلی نہ کی اور اسی طرح سو گیا، اگر دانتوں میں اٹکا ہوا کھانا چنے کی مقدار کے برابر یا اس سے زیادہ حلق میں اتر گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اس صورت صرف قضاء واجب ہوگی کفارہ نہیں ہوگا اور اگر چنے کی مقدار سے کم ہو تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا (احسن الفتاوی: ۴/۴۲۳)

سحری کے متعلق کچھ اہم گزارشات:

سحری کا ایک مستحب وقت ہے، بہتر یہ ہوگا کہ اس کا لحاظ کیا جائے، بعض لوگ بہت تاخیر سے کھاتے ہیں، بسا اوقات سحری کا وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے بھوکے رہ جاتے ہیں اور کبھی وقت نکل جانے کا خیال نہیں رہتا اور کھاتے چلے جاتے ہیں، جس سے روزہ ختم ہو جاتا ہے، بعض لوگ آدھی رات سے ہی سحری کھانا شروع کر دیتے ہیں، اتنی جلدی سحری کھانا شریعت کے منشأ اور سحری کے مقصد کے خلاف ہے، ہاں اگر کوئی عذر ہے مثلاً سفر درپیش ہے تو جلدی کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، بعض لوگ سحری تو مناسب وقت میں کھاتے ہیں لیکن چائے، پان، بیڑی، سگریٹ وغیرہ کا استعمال بالکل آخری وقت میں کرتے ہیں، اس سے اکثر روزہ خطرے میں پڑ جاتا ہے، بعض لوگ سحری جلدی کھا کر سو جاتے ہیں اور فجر قضا کر دیتے ہیں، یہ بہت بڑا گناہ ہے، اسی طرح یہ بھی مناسب نہیں کہ جلدی سونے کی وجہ سے نماز گھر پر پڑھ لی جائے اور نماز با جماعت کا اہتمام نہ کیا جائے، رمضان میں سحر و افطار کے جو نقشے چھپے چھپائے تقسیم ہوتے ہیں ان کو دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کسی قابل اعتماد ادارے نے شائع کئے ہیں یا نہیں، پھر ان کے اوقات میں ایک آدھ منٹ کی احتیاط کر لینی چاہئے۔

سحری کے لیے جگانے کا مسئلہ:

(۱) سحری کے اختتام کی اطلاع دینے کے لیے گھنٹہ پیٹا جا سکتا ہے، یا دف بجایا جا سکتا ہے، بہ شرطیکہ باجے کے طرز پر نہ ہو، گولے بھی چھوڑے جا سکتے ہیں، سائرن بھی بجانے کی اجازت ہے، نکاح اور اعلان جنگ کے لیے دف بجانا احادیث سے ثابت ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے سحر و افطار کے وقت بھی ان چیزوں کی اجازت دی گئی ہے، کیوں کہ مقصود اطلاع ہے (فتاوی رحیمیہ: ۲/۴۰، امداد الفتاوی: ۲/۱۰۱ کفایۃ المفتی: ۲/۲۴)

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ آج کل ہمارے شہروں اور قصبوں میں لاؤڈ اسپیکر وغیرہ کے ذریعے تمام شہر اور قصبے میں گھوم گھوم کر سحری کا اعلان کیا جاتا ہے نعتوں اور قوالیوں کی کیسٹیں بجائی جاتی ہیں، ہمارے ملک میں ملی جلی آبادیاں ہیں غیر مسلم بڑی تعداد میں رہتے ہیں، ان حالات میں اس طرح کی ہنگامہ آرائی برادران وطن کے لیے تکلیف دہ ہے، کیوں کہ اس سے ان کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے، بعض مسجدوں کے میناروں پر ہارن لگا دیئے جاتے ہیں، تلاوت کلام پاک کے لیے مائک پر بچوں کو بٹھا دیا جاتا ہے، جو سحری کے وقت تک پڑھتے رہتے ہیں، ایک تو یہ عمل قرآن کریم کے ساتھ بے ادبی ہے، کیوں کہ قرآن کریم کا ادب یہ ہے کہ اسے غور کے ساتھ سنا جائے، ایسے وقت میں جب کہ عورتیں کھانے پکانے میں مصروف ہوں اور مرد آرام کر رہے ہوں یا وضو نماز کر رہے ہوں تلاوت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے، پھر غیر مسلم بھائیوں کو ہماری تلاوت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، انہیں کیوں پریشان کیا جائے، اگر خالص مسلم آبادیاں ہوں تب بھی اس طرح کے اعلانات نہ ہونے چاہئیں، کیوں کہ گھروں میں بیمار اور ضعیف لوگ بھی رہتے ہیں، ذرا سے شور سے ان کی آنکھ کھل جاتی ہے، خاص طور پر دل کے مریض تو معمولی شور بھی برداشت نہیں کر پاتے، بہتر ہوگا کہ جگانے کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو کسی کے لیے اذیت کا باعث نہ بنے، مثلاً نوجوان اپنے اپنے علاقوں میں گھر گھر جا کر کنڈی بجا دیا کریں، اس سے مقصد بھی حاصل ہو جائے گا اور کسی کو تکلیف بھی نہیں ہوگی، البتہ سحری کے اختتام کے اعلان کے لیے گھنٹے وغیرہ کا نظام بنا لینا چاہئے اور اسے مختصر وقفے تک محدود رکھنا چاہئے۔

رمضان میں تہجد:

اللہ جسے توفیق دے اسے تہجد کی نماز کا ضرور اہتمام کرنا چاہئے، نماز تہجد یہ ہے

کہ عشاء کے بعد رات کو سو کر اٹھیں اور کچھ نوافل پڑھیں، سونے سے قبل جو کچھ نفلیں پڑھیں گے وہ تہجد میں شمار نہیں ہوں گی، حدیث کی کتابوں میں نماز تہجد کے بے شمار فضائل آئے ہیں، ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **افضل الصلوۃ بعد الفریضۃ صلوۃ اللیل (مسلم: ۸۲۱/۲، رقم الحدیث: ۱۱۶۳)** "فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل تہجد کی نماز ہے" دور صحابہؓ سے لے کر آج تک تمام علماء امت کا معمول تہجد کی نماز پڑھنے کا رہا ہے، صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ کوئی شخص تہجد کی نماز پڑھے بغیر درجۂ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا، نماز تہجد سنت ہے اور رات کا آخری حصہ اس کا بہترین وقت ہے، اس نماز کی کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعتیں ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات آٹھ رکعات پڑھا کرتے تھے (عمدۃ الفقہ: ۱۶۳/۲)

رمضان میں تہجد کی نماز بہ سہولت پڑھی جاسکتی ہے، کیوں کہ تہجد اور سحری کا وقت تقریباً ایک ہی ہوتا ہے، اگر سحری کے لیے کچھ دیر پہلے اٹھ جائیں تو بہ آسانی نوافل ادا کئے جاسکتے ہیں اور اگر سحری سے کچھ جلدی فراغت ہو جائے تو صبح صادق سے پہلے بھی تہجد ادا کرنے کی گنجائش ہے، اگر تھوڑی سی ہمت کرلی جائے تو رمضان کے پورے مہینے بہ سہولت تہجد کی نماز ادا کی جاسکتی ہے، یاد رہے تہجد کا وقت صبح صادق سے پہلے ہے، بعض لوگ اذان تک بھی تہجد کے نوافل پڑھتے رہتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ اذان صبح صادق کے بعد ہوتی ہے اور بعض جگہوں پر تو بہت بعد میں ہوتی ہے۔

رمضان میں فجر کی نماز:

فقہ حنفی کے مطابق اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھنے کے بہ جائے تاخیر کر کے پڑھی جائے تاکہ کچھ روشنی سی پھیل جائے لیکن رمضان المبارک میں فجر کی نماز میں جلدی کی جاسکتی ہے بلکہ یہ بہتر بھی ہے، کیوں کہ اس سے زیادہ لوگ

جماعت میں شریک ہوسکتے ہیں، سحری کے بعد بہت دیر تک انتظار کرنا لوگوں کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، فجر کی نماز میں تاخیر کی مصلحت یہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ مسجد میں پہنچ جائیں، رمضان میں یہ مقصد جلدی حاصل ہوجاتا ہے، کیوں کہ سب ہی لوگ اس وقت بیدار ہوتے ہیں، اس لیے صبح صادق کے بعد لوگوں کا لحاظ کرتے ہوئے فجر کی نماز جلدی پڑھ لینی چاہئے، اس سے زیادہ لوگوں کو نماز با جماعت کی توفیق ہوجاتی ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۳۲۸/۵، کفایۃ المفتی: ۶۹/۳)

بعض روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت انس بن مالکؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھائی، پھر فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہوئے (حضرت انسؓ کہتے ہیں) میں نے پوچھا کہ سحری اور نماز کے درمیان کتنا فاصلہ تھا انہوں نے کہا "پچاس آیات کے بہ قدر" (بخاری: ۶۷۸/۲، رقم الحدیث: ۱۸۲۱) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سحری اور نماز فجر کے درمیان زیادہ وقفہ نہیں فرمایا کرتے تھے۔

افطار:

افطار کے فضائل اور مسائل پر کچھ لکھنے سے پہلے ہم افطار میں رزق حلال کی ضرورت اور کم کھانے کی اہمیت پر مشہور عالم اور بزرگ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ کی کتاب "احیاء العلوم" سے ایک اقتباس پیش کریں گے، امام غزالیؒ نے لکھا ہے: "افطار کے وقت اکل حلال کی پابندی کی جائے، حرام کے شبہے سے بھی گریز کیا جائے، اس صورت میں روزے کے کوئی معنی نہیں کہ دن میں حلال کھانے سے رُکا رہے اور جب افطار کرنے بیٹھے تو حرام رزق سے روزہ افطار کرے، یہ روزہ دار اس شخص کی طرح ہے جو ایک محل تعمیر کرائے اور ایک شہر منہدم کردے، جس طرح زہر جسم کے لیے مہلک ہے اسی طرح حرام رزق بھی دین کے لیے مہلک ہے، حلال کھانا بھی کم

کھانا چاہئے اس کی مثال ایک دوا کی سی ہے جس کی کم مقدار مفید ہے اور زیادہ مقدار مضر ہے، روزے کا مقصد یہ ہے کہ حلال کھانا بھی کم کھایا جائے تا کہ مفید ہو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی ظرف اتنا برا نہیں جتنا براوہ پیٹ ہے جو حلال رزق سے بھر دیا گیا ہو عادتاً لوگ افطار وسحر میں اتنا کھا جاتے ہیں کہ رمضان کے علاوہ دنوں میں کئی مہینے اتنا نہیں کھاتے، روزے کا اصل مفہوم یہ ہے کہ پیٹ خالی رہے اور نفس کی خواہشات ختم ہو جائیں، اس صورت میں روزہ کا یہ مقصود حاصل نہیں ہوتا کہ دن بھر معدے کو بہلایا جائے اور جب شام کے وقت خواہش بڑھ جائے اور رغبت حاصل ہو جائے تو لذیذ کھانے کھائے جائیں اور خوب شکم سیری حاصل کی جائے۔ یقیناً اس صورت میں تقویٰ پیدا نہیں ہوتا بلکہ کھانے کی رغبت اور بڑھتی ہے اور خواہشوں کو مزید تحریک ملتی ہے"۔(احیاء العلوم:۱/۴۰۹)

افطار کی فضیلت:

تمام دن کی بھوک پیاس کے بعد سورج غروب ہونے پر روزہ دار کو روزہ افطار کرنا ہے، یقیناً یہ لمحہ خوشی کا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ پابندی ہٹا دی ہے اور اب اس کا روزہ دار بندہ صبح صادق تک کھانے پینے کے لیے آزاد ہے، کیوں کہ روزہ دار نہ اپنی مرضی سے کھانا پینا چھوڑ رہا ہے اور نہ اپنی مرضی سے افطار کر رہا ہے بلکہ جو کچھ کر رہا ہے اللہ کے حکم سے کر رہا ہے، اس لیے جس طرح اس نے سحری کے کھانے میں فضیلت وبرکت رکھی ہے اسی طرح افطار میں بھی برکت اور فضیلت رکھ دی ہے، جو کھانا افطار کے وقت کھایا جاتا ہے وہ اتنا مبارک ہے کہ امید ہے اس میں حدیث شریف کے بہ موجب حساب کتاب نہیں ہوگا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین لوگوں سے ان کے کھانے کے معاملے میں ان شاء اللہ حساب نہیں ہوگا، ایک روزہ افطار کرنے والا، دوسرا سحری کھانے والا، تیسرے اللہ کے راستے میں پہرا دینے والا

(المعجم الکبیر:۱۱/۳۵۹، رقم الحدیث:۱۲۰۱۲) افطار کے وقت روزہ دار کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے حدیث شریف میں اسے اس خوشی کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو مومن کو قیامت کے روز اپنے رب سے ملاقات کے وقت حاصل ہوگی، حضرت ابو ہریرہؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ "روزہ دار کے لیے دو خوشیاں ہیں ایک افطار کے وقت اور ایک اپنے رب سے ملاقات کے وقت" (صحیح بخاری:۲/۶۷۳، رقم الحدیث:۱۸۰۵) شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ روزہ دار کو افطار کے وقت یہ خوشی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ اب کھانے پینے کے لیے آزاد ہو گیا بلکہ اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ کے فضل وکرم سے ایک روزہ پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اسی کے ساتھ اللہ کی نعمتیں جو دن بھر کے لیے حرام کر دی گئی تھیں حلال ہو گئیں۔

افطار کے وقت دعاؤں میں مشغول ہونا چاہئے:

عام طور پر لوگ افطار کے وقت ادھر اُدھر کے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں، عورتیں افطار کا سامان تیار کرنے اور اس کو قرینے سے لگانے سجانے میں منہمک نظر آتی ہیں، مرد بازاروں کی چہل پہل میں اضافہ کرنے کے لیے نکل پڑتے ہیں اور بچے کھیل کود میں مصروف ہو جاتے ہیں، لیکن یہ وقت بہت اہم ہے اور دعاؤں کی قبولیت کا ہے، یوں تو رمضان المبارک کا پورا مہینہ ہی قبولیت دعا کا ہے، لیکن اس ماہ کے کچھ مخصوص اوقات ایسے ہیں جن میں رحمت حق اور زیادہ متوجہ ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ان خاص اوقات میں مانگی گئی دعائیں اپنے فضل وکرم سے قبول فرما لیتے ہیں، افطار کا وقت بھی کچھ ایسا ہی خاص ہے، متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ افطار کے وقت مانگی جانی والی دُعا رد نہیں کی جاتی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ روزہ دار کی دعا رد نہیں کی جاتی (مصنف ابن ابی شیبہ:۲/۲۷۴

رقم الحدیث: ۸۹۰۲) حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ کی روایت میں ہے "بلاشبہ افطار کے وقت روزہ دار کی دعا رد نہیں کی جاتی" (بیہقی ۳/ ۳۴۵،) اسی بات کو ان لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے: افطار کے وقت روزہ دار کی دعا قبول کی جاتی ہے (کنز العمال: ۸/ ۴۴۸)

جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ افطار کے وقت اللہ تعالیٰ سے جو دعائیں مانگی جاتی ہیں وہ بارگاہِ حق میں قبولیت سے سرفراز کی جاتی ہیں تو روزہ داروں کو چاہئے کہ وہ لایعنی کاموں میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بہ جائے دعاؤں میں مشغول ہوں ضروری کام پہلے انجام دے لئے جائیں خواتین بھی کھانے پکانے سے فارغ ہو جائیں اور بچوں کو بھی ہدایت کریں کہ وہ کچھ وقت کے لیے یک سُو ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائیں اور دُعا کریں، یہ موقع سال بھر میں صرف تیس دنوں کے لیے ملتا ہے آپ اس وقت ہر طرح کی دعائیں مانگ سکتے ہیں، یہ قبولیت کی گھڑی ہے جو بھی دعا مانگیں اس یقین کے ساتھ مانگیں کہ آپ کی دُعا قبول ضرور ہوگی، مغفرت کی خیر و برکت کی، صحت وتن درستی کی، قرض سے سبک دوشی کی، دین ودنیا کی فلاح کی، ملک میں اور دنیا میں امن وامان کی اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے، اپنے بچوں کے لیے رشتے داروں کے لیے سب کے لئے دعائیں مانگیں، احادیث کی کتابوں میں اس موقع پر مانگی جانے والی دعائیں بھی منقول ہیں، دعاؤں کی کوئی کتاب پاس ہو تو اور بہتر ہے اس طرح کی دعاؤں میں زیادہ خیر و برکت اور تاثیر ہوتی ہے، مگر اجتماعی دعا نہ کریں کیوں کہ اس موقع پر اجتماعی دعا منقول نہیں ہیں، بعض جگہوں پر لوگ افطار کے وقت ایک جگہ سمٹ آتے ہیں اور کوئی صاحب بہ آواز بلند دعا شروع کرا دیتے ہیں اور یہ سلسلہ افطار کے وقت تک جاری رہتا ہے، یہ غلط ہے روایات سے اس کا ثبوت نہیں ملتا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر دُعا مانگنے میں مشغول رہے۔

افطار کی دعا:

جب افطار کا وقت آجائے تب بھی دل اور زبان یادِ خدا سے غافل نہ ہوں اس موقع پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دُعا منقول ہے: اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ (ابو داؤد: ۱/ ۷۱۹، رقم الحدیث: ۲۳۵۸) "اے اللہ میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی رزق سے افطار کیا" بعض کتابوں میں وَبِکَ آمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ کا بھی اضافہ ملتا ہے، یہ حدیث کے الفاظ نہیں ہیں، اگرچہ ان کا مفہوم صحیح ہے، مگر جب ایک دعا سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ کلمات میں موجود ہے تو اس پر اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کرنا چاہئے۔ افطار سے فارغ ہونے کے بعد یہ دعا پڑھ لینی چاہئے: ذَھَبَ الظَّمأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْأَجْرُ إِنْ شَاءَ اللّٰہُ (ابو داؤد، ۱/ ۷۱۹، رقم الحدیث: ۲۳۵۷، سنن الدار قطنی: ۱/ ۷۱۹، رقم الحدیث: ۲۵) "پیاس جاتی رہی رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہو گیا ان شاء اللہ تعالیٰ" اگر عربی زبان کے الفاظ کی ادائیگی میں دشواری ہو تو اردو ترجمہ زبان سے ادا کر لینا چاہئے۔

روزہ کس چیز سے افطار کرنا چاہئے:

ویسے تو آپ کسی بھی چیز سے روزہ افطار کر سکتے ہیں، جو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے کھائیں، بس اس کا خیال رہے کہ جو کچھ کھائیں وہ جائز اور حلال ہو، مگر کیوں کہ یہ عبادت کا موسم ہے، اس موسم میں ہمیں کوشش یہی کرنی چاہئے کہ ہمارا ہر ہر عمل سنت کے مطابق ہو، یہاں تک کہ ہم کھانے پینے میں بھی وہی طریقہ اپنائیں جو ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلا دیا ہے، روایات میں ہے کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے سے قبل چند کھجوروں سے روزہ افطار فرمایا کرتے تھے، اگر کھجوریں نہ ہوتیں تو چھوارے تناول فرماتے، چھوارے بھی نہ ہوتے تو پانی سے روزہ افطار فرما لیتے

(ترمذی:۳/۷۹،رقم الحدیث:۶۹۶)اس سلسلے میں متعدد روایات بھی موجود ہیں ایک روایت میں ہے سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''جب تم میں سے کوئی افطار کرے تو اسے کھجور سے روزہ افطار کرنا چاہئے، کیوں کہ اس میں برکت ہے، اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کرے، کیوں کہ پانی پاکیزہ ہوتا ہے'' (ترمذی:۳/۴۶ رقم الحدیث:۶۵۸)

کھجور کی اہمیت:

کھجور ایک ایسا پھل ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی ہے، حدیث کی کتابوں میں بھی ہے اور موجودہ دور کے میڈیکل سائنس داں بھی اس کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بے شمار احسانات اور انعامات کے ضمن میں بہت سے پھلوں کا ذکر کیا ہے جو انسان کو عطا کئے گئے ہیں، مثلاً انگور، انجیر، انار اور زیتون کا ذکر متعدد مرتبہ آیا ہے، مگر کھجور اور اس کے درخت کا تذکرہ قرآن کریم میں بیس مقامات پر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے اس پھل کو بنی نوع انسان کے لیے نہایت اہمیت کا حامل قرار دیا ہے، احادیث میں تو کھجور کا ذکر بار بار آیا ہے اور مختلف عنوانات کے ذیل میں سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر فرمایا ہے: ام المؤمنین حضرت عائشہ الصدیقہؓ سے روایت ہے کہ سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا''جس گھر میں کھجور ہو اس گھر کے لوگ بھوکے نہ رہیں گے'' (مسلم:۳/۱۶۱۸، رقم الحدیث:۲۰۴۶) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات اس طرح بھی ارشاد فرمائی ہے''اے عائشہؓ جس گھر میں کھجور نہ ہو اس گھر کے لوگ بھوکے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی (مسلم:۳/۱۶۱۸ رقم الحدیث:۲۰۴۶) اسی طرح ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ''جس گھر میں کھجور نہ ہو وہ گھر ایسا ہے جس میں

کھانا نہ ہو'' (المعجم الکبیر:۲۴/۲۹۸، رقم الحدیث:۷۵۷) بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم کچھ لوگ سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ کھجور کا ایک گابھا آیا، سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ درختوں میں سے ایک درخت ایسا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی برکت دی ہے جیسے وہ مسلمان ہو، اس پر میں نے یہ خیال کیا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد کھجور کے درخت سے ہے، میرا ارادہ بھی ہوا کہ عرض کروں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ کھجور کا درخت ہے مگر میں کل دس سال کا تھا (چھوٹا تھا) اس لیے چپ رہا، پھر سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے (بخاری:۱/۳۹، رقم الحدیث:۷۲) عجوہ کھجور کے متعلق تو حدیث میں ہے کہ سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:''عجوہ کھجور اور بیت المقدس کا پتھر (جس پر براق باندھا گیا تھا) دونوں جنت سے آئے ہیں (ابن ماجہ:۲/۱۱۴۳، رقم الحدیث:۳۴۵۶)

طب نبوی میں کھجور:

عجوہ کھجور کی افادیت پر مشتمل بہت سی روایات ہیں، خاص طور پر اس کا استعمال زہر اور سحر کے لیے بے حد مفید ہے، حضرت عامرؓ کے والد ابو وقاصؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سعد سے سنا ہے کہ سرکاردو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص نے صبح اٹھتے ہی عجوہ کھجور کے سات دانے کھالئے اس دن اسے جادو اور زہر نقصان نہ دیں گے (بخاری:۵/۲۱۷۷، رقم الحدیث:۵۴۳۶)

روایات میں کھجور کو متعدد دوسرے امراض میں بھی مفید بتلایا گیا ہے، مثال کے طور پر دبلا پتلا انسان اگر موٹا ہونا چاہے تو اسے کھجور اور کھیرا کھانا چاہئے، جیسا کہ حضرت عائشہ الصدیقہؓ کا ذاتی تجربہ ہے کہ انہوں نے رخصتی سے پہلے یہ دونوں چیزیں استعمال کیں اور فربہ ہوگئیں (ابن ماجہ:۲/۱۱۰۴، رقم الحدیث:۳۳۲۴) قولنج

(درد کے ساتھ پٹھوں میں سکڑن) کے لیے بھی کھجور کا استعمال مفید ہے، پیٹ کے کیڑے بھی اس کے استعمال سے مرجاتے ہیں، عجوہ کھجور کے سات دانے روزانہ کھانے سے کوڑھ کو بھی فائدہ ہوتا ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد ابن ابی وقاص کے لیے جنہیں دل کا دورہ پڑا تھا مدینہ کی سات عجوہ کھجور گٹھلیوں سمیت کوٹ کر کھانے کا مشورہ دیا، ایک روایت میں ہے کہ عورتوں کے ایام میں زیادتی ہو تو انہیں کھجور دینی چاہئے یہ تمام روایات مشہور محدث ابو نعیم نے اپنی کتاب الطب میں بیان کی ہیں۔

سائنس کیا کہتی ہے؟

اطباء نے دوسرے امراض میں بھی کھجور کے تجربے کئے ہیں اور فوائد حاصل کئے ہیں، اس کے استعمال سے انسان بلغم اور سردی کے مضر اثرات سے محفوظ رہتا ہے اس سے دماغ کی کمزوری ختم ہوتی ہے، کھجور بدن میں خون کی کمی دور کرتی ہے اور قلب کو قوت بخشتی ہے، گردوں کے امراض کے لیے بھی مفید ہے، سانس کی تکالیف بالعموم اور دمہ کے مرض میں خاص طور پر فائدہ پہنچانے والی ہے، کھانسی، بخار، پیچش اور قبض کے امراض میں اطباء اس کے ذریعے علاج تجویز کرتے ہیں، قوت باہ کو بڑھاتی ہے کھجور زخموں کو مندمل کرتی ہے، نفث الدم میں بھی کارگر ہے، یرقان کے لیے بھی مفید ہے، اس کے استعمال سے جگر کا فعل درست رہتا ہے، پیشاب آور بھی ہے، خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کھجور غذا کی غذا ہے اور دواء کی دواء، پہلے اس کی پیداوار جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی، بعد میں دوسرے ممالک میں بھی اس کے باغ لگائے جانے لگے، اب تو امریکہ اور یورپ میں بھی اس پھل کی مختلف اقسام کی پیداوار پر بھرپور توجہ دی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس چھوٹے سے پھل میں کتنے فوائد رکھ دیئے ہیں اس کی تحقیقات کے لیے بڑے بڑے ادارے کام کررہے ہیں، اس کی غذائیت کا اندازہ اس کے مختلف کیمائی اجزاء سے لگایا جاسکتا ہے، اس میں تقریباً ساٹھ فی صد شکر کے علاوہ

اسٹارچ پروٹین اور چربی مختلف مقدار میں موجود ہے، وٹامن اے، وٹامن بی، وٹامن بی ٹو، وٹامن سی بھی پائے جاتے ہیں، اور سوڈیم، کیلشیم، سلفر، کلورین، فاسفورس اور آئرن جیسے معدنیاتی اجزاء بھی اس پھل کے اندر موجود ہیں، حدیث شریف میں اس پھل کو مسلمان سے اسی لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ دونوں ہی انسانوں کی بھلائی کا ذریعہ ہیں، حدیث شریف میں روزہ افطار کرنے کے لیے کھجور کے استعمال کی ترغیب بلاوجہ نہیں دی گئی ہے، کیوں کہ روزے کے دوران مسلسل بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے بدن میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے، افطار کے وقت ایک ایسی غذا کی ضرورت ہے جو توانائی سے بھرپور بھی ہو، سریع الہضم بھی ہو اور جسم میں جاتے ہی اس کے اثرات بھی شروع ہوجائیں۔

روزہ جلدی افطار کریں:

وقت ہونے کے بعد بلا تاخیر روزہ افطار کرلینا چاہئے، بہتر یہی ہے کہ روزہ افطار کرنے سے کچھ دیر پہلے دسترخوان پر بیٹھ جائیں اور جیسے ہی روزے کا وقت ختم ہونے کا اعلان ہو افطار شروع کردیں، حدیث شریف میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "لوگ اس وقت تک خیر کے ساتھ رہیں گے جب تک افطار میں جلدی کرتے رہیں گے" (بخاری:۲/۶۹۲، رقم الحدیث:۱۸۵۶، مسلم:۲/۷۷۱، رقم الحدیث:۱۰۹۸، ابن ماجہ:۱/۵۴۱، رقم الحدیث:۱۶۹۷) افطار میں عجلت کے سلسلے میں متعدد روایات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ افطار کرنے میں تاخیر کو برا سمجھا گیا ہے، مگر اس عجلت کا مفہوم یہ ہے کہ جب وقت کا یقین ہوجائے تب افطار کیا جائے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ جیسے ہی کچھ تاریکی محسوس ہو فوراً افطار شروع کردے، اس سلسلے میں احتیاط بے حد ضروری ہے، اسی احتیاط کے پیش نظر افطار و سحر کے نقشۂ نظام الاوقات میں یہ ہدایت درج ہوتی ہے

کہ سحری وقت سے پانچ منٹ پہلے چھوڑ دی جائے اور افطار وقت معین سے دو منٹ تاخیر سے شروع کیا جائے۔

مسجد میں افطار:

حرمین شریفین میں اجتماعی طور پر روزہ افطار کرنے کا معمول ہے، ہمارے شہروں اور قصبوں کی مساجد میں بھی لوگ گھروں سے افطار کا سامان لاکر ایک ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور روزہ افطار کرتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اگر یہ کام اس جذبے سے ہو کہ مسافر یا محلے کے غریب لوگ بھی افطار میں شریک ہو جائیں گے تو باعث اجر وثواب بھی ہے ان شاء اللہ، مگر اس عمل سے مساجد کا ادب واحترام اور اس کی نظافت متاثر نہ ہونی چاہیے، عموماً لوگ افطار کرکے گھٹلیاں اور پھلوں کے چھلکے وغیرہ مسجد میں ڈال دیتے ہیں، چاول کے دانے یا روٹی کے ریزے بھی صفوں پر پڑے رہتے ہیں، یہ طریقہ مناسب نہیں ہے، افطار سے فارغ ہونے کے بعد دسترخوان اور برتن وغیرہ سلیقے سے سمیٹ دینے چاہئیں، مسجد کا ادب یہ ہے کہ افطار کے وقت شور شرابہ اور دھینگا مشتی نہ ہو، بلکہ خاموشی کے ساتھ کھایا جائے، اور جماعت کھڑی ہونے سے پہلے پہلے فراغت حاصل کرلی جائے، بعض اوقات نماز شروع ہو جاتی ہے اور لوگ کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں، جب امام رکوع میں چلا جاتا ہے تو اسے دوڑ بھاگ کر پکڑتے ہیں، بہتر یہ ہوگا کہ بیرون مسجد کوئی الگ جگہ کمرہ یا برآمدہ وغیرہ اس کام کے لیے خاص کرلیا جائے۔

مغرب کی نماز میں تاخیر:

مغرب کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے، اسی لیے اذان ہوتے ہی نماز شروع کر دی جاتی ہے لیکن رمضان میں کھانے پینے کے معمولات تبدیل ہو جاتے ہیں، اگر اذان اور نماز میں تھوڑا بہت فصل نہ ہو تو افطار کرنے کے بعد گھر سے چل کر مسجد تک بروقت

پہنچنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ اذان کے بعد کچھ انتظار کرلیا جائے لیکن یہ وقفہ مختصر ہونا چاہیے، اگر زیادہ دیر لگائی گئی تو مکروہ وقت ہو جانے کا اندیشہ ہے نیز اس سے ان نمازیوں کو بھی تکلیف ہوگی جو مختصر افطار کر کے مسجد میں آجاتے ہیں اور نماز سے فراغت کے بعد اطمینان سے کھانے کے عادی ہیں، حضرات مفتیان کرام نے لکھا ہے کہ اذان وجماعت میں اتنا فصل کیا جائے کہ پابند جماعت افطار سے فارغ ہو کر کلی وغیرہ کرلیں اور شروع جماعت سے شریک ہو سکیں، آپس کی مشاورت سے پانچ دس منٹ جیسا مناسب ہو تجویز کرلیں (فتاوی محمودیہ جدید: ۱۰/۲۱۲) بہ ہر حال افطار کی وجہ سے نماز میں حسب ضرورت تاخیر بلا کراہت جائز ہے (فتاوی دار العلوم: ۶/۴۵)

روزہ کشائی کی تقریبات:

مسلم معاشرے میں روزہ کشائی کی تقریبات کا چلن دن بہ دن بڑھتا جارہا ہے، لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو روزہ رکھوا دیتے ہیں اور اس موقع پر بڑی بڑی دعوتوں کا اہتمام کرتے ہیں، یہ محض ایک رسم ہے اور اس کے پیچھے نام ونمود کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے، روزہ عبادت ہے، ابھی بچے اس عبادت کے مکلف نہیں ہیں، پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچوں کو بھوکا پیاسا رکھنا کون سی دانش مندی ہے، پھر اگر یہ کام عبادت سمجھ کر کیا جاتا ہے تو اس میں ڈھنڈورہ پیٹنے کی ضرورت کیا ہے، اس طرح تو پہلی مرتبہ نماز پڑھنے کے موقع پر بھی تقریب نماز ادائی کا اہتمام کرنا چاہیے، پھر ان تقریبات میں لغویات زیادہ ہوتی ہیں، فوٹو گرافی اور بے پردگی تو عام بات ہے، نماز باجماعت تو چھوڑیے نماز تک کا خیال نہیں آتا، فضول خرچی الگ ہے، اگر یہ رقم غریبوں کو دے دی جائے تو ان کے کام آجائے، ثواب بھی ہوگا اور غریبوں کا رمضان بھی اچھا گزرے گا، یوں بھی رمضان کے لیل ونہار عبادت کے لیے ہیں نہ کہ دعوتیں اڑانے کے لیے۔

روزہ افطار کرانا:

البتہ بہ نیت ثواب کچھ روزہ داروں کو افطار پر مدعو کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ عین ثواب ہے، اس میں امیر غریب کی بھی کوئی تخصیص نہیں حدیث شریف میں ہے کہ روزہ افطار کرانے پر اللہ تعالیٰ تین انعام عطا فرماتے ہیں (۱) گناہوں کی مغفرت (۲) دوزخ کی آگ سے نجات (۳) روزہ دار کے برابر ثواب۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ افطار میں پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے بلکہ ایک چھوارے، کھجور یا دودھ کی کچھ لسی یا پانی کے ایک گھونٹ کا بھی اتنا ہی اجر ہے (صحیح ابن خزیمہ بحوالہ ترغیب والترہیب: ۹۲/۲) بعض لوگ کسی کے یہاں اس لیے افطار نہیں کرتے کہ اس طرح ان کا اجر وثواب کم ہو جائے گا، یہ ان کی بڑی غلط فہمی ہے روزہ دار کا ثواب اپنی جگہ ہے، البتہ روزہ افطار کرانے والے کو روزہ دار کا ثواب کم کئے بغیر اس کے روزے کا اجر عطا کیا جائے گا، جیسا کہ حضرت زید بن خالد الجہنیؓ کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”جس شخص نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کے لیے روزہ دار کے برابر اجر ہے لیکن روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی (ترمذی: ۱۷۱/۳، رقم الحدیث: ۸۰۷، ابن ماجہ: ۵۵۵/۱، رقم الحدیث: ۱۷۴۶) لیکن شرط یہ ہے کہ حلال کھانے سے افطار کرایا جائے، کسی کو حرام کھلانا بڑے گناہ کی بات ہے خاص طور پر روزہ دار کو حرام کھانا کھلانا تو بہت ہی بڑا گناہ ہے، حضرت سلمان الفارسیؓ کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی روزہ دار کو حلال کھانے سے افطار کرائے تو رمضان کی ساعتوں میں فرشتے اس شخص پر رحمت بھیجتے ہیں اور شب قدر میں خود حضرت جبرئیل امینؑ اس پر رحمت بھیجتے ہیں (کنز العمال: ۴۹۸/۸ رقم الحدیث: ۲۳۶۵۸)

افطار پارٹیاں:

اب افطار پارٹیاں بھی دی جانے لگی ہیں، خاص طور پر سیاست اور حکومت کے شعبے سے وابستہ لوگوں میں ان پارٹیوں کا بڑا چلن ہے، ایسی پارٹیوں میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے، شریک ہونے والوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جنہیں روزہ نماز سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، یہ پارٹیاں روزے کی روح کے خلاف ہیں، روزہ ایک عبادت ہے کوئی نمائشی چیز نہیں ہے کہ اس کے نام پر سیاسی روٹیاں سینکی جائیں، جو لوگ اس طرح کی تقریبات کو باہمی اتحاد اور یگانگت کا حصہ سمجھتے ہیں وہ بتلائیں کہ گذشتہ ساٹھ سالوں سے یہ پارٹیاں دی جارہی ہیں کیا ملک میں اتحاد کی فضا بنی؟ مسلمان جذباتی قوم ہیں، اس طرح کی تقریبات سے بہل جاتے ہیں، ہماری رائے یہ ہے کہ ان افطار پارٹیوں میں جا کر اپنے روزے کی روحانی کیفیت کو قربان نہ کیا جائے۔

افطار سے متعلق کچھ اور باتیں:

افطار کا وقت بڑے صبر وتحمل کے مظاہرے کا وقت ہے، یہ صحیح ہے کہ ہر شخص اس وقت گھر پہنچ کر افطار کرنے کی خواہش رکھتا ہے اسی لیے بازاروں اور سڑکوں پر بھیڑ بڑھ جاتی ہے، نتیجۃً حادثات بھی پیش آتے ہیں، بسا اوقات آگے نکلنے کی خواہش میں گالم گلوچ اور جوتم پیزار کی نوبت آجاتی ہے، افطار کا ثواب اپنی جگہ یہ ثواب تو سڑک پر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، لیکن گھر پہنچنے کی جلدی میں جھگڑا فساد کرنا تو بڑا گناہ ہے سارے دن روزہ رکھ کر آخری وقت میں اس کا ثواب ضائع کر دینا کہاں کی دانائی ہے کوشش یہ کرنی چاہئے کہ اتنے پہلے افطار کے لیے نکلا جائے کہ وقت سے پہلے پہلے پہنچنا ہو جائے اور اگر کسی وجہ سے بھیڑ میں پھنس جائے تو مشتعل نہ ہو بلکہ صبر کرے، اس کا اجر الگ ہوگا ان شاء اللہ، افطار میں بھی وقار وسکون کے ساتھ مشغول ہونا چاہئے بھوکوں اور ندیدوں کی طرح کھانے پر نہ گرنا چاہئے اور نہ اتنا ٹھونس ٹھونس کر کھانا چاہئے کہ مغرب کی

نماز کے لیے بھی نہ اٹھ سکے اور تراویح بھی گول ہوجائے، یا اگر نماز میں بہ مشکل تمام کھڑا بھی ہوجائے تو ڈکاریں لے لے کر نمازیوں کا ناک میں دم کردے۔

رمضان کے روزے کس پر فرض ہیں؟

(۱) ہر مسلمان، عاقل، بالغ، صحت مند، مقیم مرد و عورت پر رمضان کے روزے فرض ہیں، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دیوانے پر، نابالغ پر، بیمار اور مسافر پر روزے فرض نہیں ہیں، البتہ بیمار کو صحت کے بعد اور مسافر کو سفر سے واپس ہونے کے بعد رمضان کے روزوں کی قضاء کرنی چاہئے۔

(۲) لڑکا یا لڑکی جب سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو ان پر روزہ فرض ہوجاتا ہے چاند کی تاریخوں کے اعتبار سے پندرہ سال کی عمر کے بچے بالغ سمجھے جائیں گے اگر پندرہ سال سے کم عمر کسی لڑکے کو احتلام ہوجائے یا پندرہ سال سے کم عمر کسی لڑکی کو حیض آجائے تب بھی انہیں بالغ سمجھا جائے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ بچے جب دس سال کے ہوجائیں تو ان سے روزہ رکھوایا جائے تاکہ بالغ ہوتے ہوتے وہ روزہ رکھنے کے عادی ہوجائیں۔

(۳) چار پانچ سال کے بچوں کو محض نام و نمود کے لیے یا رسم و رواج کی خاطر روزہ رکھوانا مناسب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک طرح سے گناہ ہے کہ ان کو زبردستی روزہ رکھوایا جائے (امداد الفتاوی، ج:۲، خیر الفتاوی: ج ۴)

جن چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا:

روزے میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے اور نہ مکروہ ہوتا ہے بعض مرتبہ یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ فلاں کام کرلینے سے روزہ ٹوٹ گیا، یہ سمجھتے ہی عام دنوں کی طرح کھانا پینا شروع کردیا جاتا ہے، بہتر یہ ہوگا کہ اگر کوئی بات اس طرح کی پیش آجائے تو علماء سے رابطہ قائم کرلیا جائے، خواہ فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا جائے

یا ان کے پاس چل کر جایا جائے، کوئی بات اگر قابل شرم بھی ہے تب بھی پوچھ لینا چاہئے کیوں کہ اگر معلوم نہیں کیا تو صحیح مسئلے کا علم نہیں ہوگا اور جب صحیح مسئلہ سامنے نہیں آئے گا تو اس پر عمل کیسے ہوگا، اگر کوئی شخص پڑھا لکھا ہے تو اسے مسائل کی کتابیں منگوا کر دیکھ لینی چاہئیں، ہر گھر میں مسائل کی کتابوں کا موجود ہونا بے حد ضروری ہے اب تو اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی بہت سی کتابیں چھپ چکی ہیں، خواتین اپنے شوہروں کے ذریعے اور شوہر نہ ہوں تو والد، بھائی یا بیٹے کے ذریعے بھی مسئلہ معلوم کرا سکتی ہیں، ذیل میں کچھ ایسے امور پر روشنی ڈالی جاتی ہیں جن کے سرزد ہونے سے روزے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

(۱) روزہ دار نے روزے کی حالت میں بھول کر کھا پی لیا یا بیوی کے پاس چلا گیا تو اس سے روزہ ختم نہیں ہوگا، کیوں کہ بھول پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اگر بھول کر کئی مرتبہ کھایا پیا تب بھی روزہ سلامت رہے گا، تھوڑا کھانے اور زیادہ کھانے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح نفل و فرض ہر طرح کے روزے کا یہی حکم ہے (مراقی الفلاح: ۳۶۰، البحر الرائق: ۴۷۳/۲) ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر روزہ دار بھول کر کھالے یا پی لے تو اسے روزہ پورا کرنا چاہئے کیوں کہ اسے اللہ نے کھلایا پلایا ہے (بخاری: ۲۴۵۵/۶، رقم الحدیث: ۶۲۹۲، مسلم: ۸۰۹/۲، رقم الحدیث: ۱۱۵۵)

(۲) البتہ اگر کوئی شخص روزے کی حالت میں بھول کر کھا رہا ہو تو یہ دیکھا جائے کہ وہ شخص کم زور اور ضعیف ہے یا تندرست و توانا، اگر بوڑھا اور کمزور ہے تو دیکھنے والے کو چاہئے کہ اسے کھانے دے یاد نہ دلائے اور اگر تن درست و توانا ہے تو اسے یاد دلانا واجب ہے (فتاوی عالمگیری: ۲۰۲/۱)

(۳) آنکھوں میں دوا یا سرمہ ڈالنا، سر ڈاڑھی یا مونچھوں پر یا بدن کے کسی

حصے پر تیل لگانا، خوشبو وغیرہ لگانا درست ہے، اگر آنکھ میں سرمہ ڈالنے کا اثر تھوک یا ناک کی ریزش میں محسوس ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۹،۲۰۲) ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں سرمہ لگایا کرتے تھے۔ کان یکتحل وھو صائم۔ (ابوداؤد: ۱/ ۷۲۴، رقم الحدیث: ۲۳۷۸)

(۴) روزے کی حالت میں مسواک کرنا بالکل درست ہے، حضرت عامر بن ربیعہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو روزے کی حالت میں بے شمار مرتبہ مسواک کرتے ہوئے دیکھا (ترمذی:۳/۱۰۴، رقم الحدیث: ۷۲۵ ابوداؤد:۱/۷۲۱، رقم الحدیث:۲۳۶۴) ایک روایت میں ہے کہ روزہ دار کی بہترین خصلت مسواک کرنا ہے (ابن ماجہ:۱/۵۳۶، رقم الحدیث:۱۶۷۷) اس لیے اگر روزہ دار مسواک کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ سنت سمجھ کر کرے تو اس میں ثواب بھی ہے، مسواک چاہے تر لکڑی کی ہو یا خشک لکڑی کی یا نیم وغیرہ جیسے درختوں کی جن میں کڑواپن ہوتا ہے ہر طرح کی مسواک جائز ہے، اگر مسواک کرنے سے منہ میں کوئی ذائقہ آ گیا تب بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا (فتاوی شامی، ۳/ ۳۹۹) مسواک کرتے ہوئے اس کا کوئی ریشہ حلق میں چلا گیا تو اس سے بھی روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، فقہاء نے اس ریشے کو چنے کے دانے سے کم مقدار پر قیاس کیا ہے (احسن الفتاوی ۴/۴۳۵) کوئلہ وغیرہ چبا کر دانت نہ صاف کرنے چاہئیں اگر کوئلے کا پیسٹ حلق کے اندر چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا، (مراقی الفلاح، ص:۲۱۰) روزے کی حالت میں ٹوتھ پیسٹ، منجن یا ٹوتھ پاؤڈر یا گل وغیرہ کا استعمال بھی مکروہ ہے، اجازت صرف مسواک کی ہے اگرچہ اس میں کچھ ذائقہ ہوتا ہے مگر وہ اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ حلق تک سرایت کر جائے، جب کہ ٹوتھ پیسٹ وغیرہ جیسی چیزوں میں بہت زیادہ ذائقہ ہوتا ہے، ان چیزوں پر مسواک کو قیاس کرنا مناسب نہیں ہے، البتہ اگر مجبوری کی وجہ سے یہ

چیزیں استعمال کی جائیں تب کوئی حرج نہیں ہے، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کا استعمال اس لیے مکروہ ہے کہ اس سے روزے کے فساد کا احتمال ہے (البحر الرائق:۲/ ۴۸۹)

(۵) حلق میں بلا اختیار گرد و غبار، دھول مٹی، مکھی مچھر یا دھواں چلا جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا ہاں اگر کسی نے اپنے ارادے اور اختیار سے دھواں حلق میں پہنچایا تو روزہ ٹوٹ جائے گا مثلاً جلتی ہوئی سگریٹ یا اگربتی اور لوبان وغیرہ کے دھویں کے قریب اپنا منہ کر کے جان بوجھ کر دھواں اندر لینے کی کوشش کی اور دھواں حلق میں چلا گیا تو روزہ فاسد ہو جائے گا (فتاوی شامی:۳/ ۳۶۶)

(۶) سوتے ہوئے غسل واجب ہونا۔ (فتاوی شامی:۳/ ۳۶۷)

(۷) بیداری کی حالت میں محض مذی نکلنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، اسی طرح اگر برے خیالات کی وجہ سے یا فحش لٹریچر کے مطالعے کی وجہ سے، یا ٹی وی اور موبائیل پر غلط تصاویر دیکھ کر منی خارج ہو جائے تو اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، (فتاوی شامی:۳/ ۳۶۷) لیکن یہ سب گناہ کی باتیں ہیں، رمضان کے علاوہ دنوں میں بھی ان سے بچنا چاہئے چہ جائیکہ رمضان جیسے مقدس مہینے میں اس طرح کی فلمیں دیکھی جائیں اور گندہ لٹریچر پڑھ کر خیالات پراگندہ کئے جائیں، بسا اوقات اس طرح کی حرکتوں سے انسان مشت زنی پر آمادہ ہو جاتا ہے، اگر مشت زنی کی وجہ سے منی خارج ہو جائے تو روزہ فاسد ہو جائے گا، اس طرح کی حرکت جائز نہیں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشت زنی کرنے والے شخص پر لعنت فرمائی ہے (فتاوی شامی:۳/ ۳۷۱)

جن چیزوں سے روزہ فاسد نہیں ہوتا (کچھ اور مسائل)

(۸) روزے کی حالت میں اپنی شریک حیات سے بوس و کنار کیا جا سکتا ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ حالت صوم یہ عمل ثابت ہے (مسلم:۲/ ۷۷۶

رقم الحدیث:۱۱۰٦) مگر یہ اس کے لیے ہے جسے انزال یا ہم بستری کا خوف نہ ہو، اس حکم کا مبنیٰ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک صحابیؓ نے روزے کی حالت میں بیوی سے دل لگی کرنے کے متعلق سوال کیا تو آپ نے انہیں اجازت دے دی، دوسرے صحابیؓ نے بھی یہی سوال کیا تو آپ نے انہیں منع فرمادیا، جن صحابیؓ کو آپ نے اجازت دی تھی وہ عمر رسیدہ تھے اور جن کو منع کیا تھا وہ جوان العمر تھے، (ابوداؤد:۱/۳۲٦، رقم الحدیث:۲۳۸۷) اس سے فقہاء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر بات بڑھنے کا خوف نہ ہو تو بوس وکنار کیا جاسکتا ہے، عموماً جوان آدمی ایسے موقع پر قابو کھودیتے ہیں، اس لیے ایسے شخص کے لیے شریک حیات سے دل لگی کرنا مکروہ ہے اور قابو یافتہ شخص کے لیے بلا کراہت جائز ہے (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴)

(۹) کان میں خود بہ خود پانی چلا گیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، لیکن اگر کسی نے جان بوجھ کر کان کے اندر پانی ڈالا تو ایک قول کے مطابق روزہ فاسد ہوجائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴)

(۱۰) کلی کرنے کے بعد منہ کی تری نگلنا، منہ کا تھوک نگلنا، ناک کو اس زور سے سڑک لینا کہ اس کی ریزش حلق کے اندر چلی جائے ان چیزوں سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۳)

(۱۱) نکسیر پھوٹنے سے یا چوٹ لگنے کے سبب جسم سے خون نکلنے کی وجہ سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، اسی طرح دانت سے خون نکلنے کی بنا پر بھی روزہ نہیں ٹوٹتا بہ شرط یہ کہ خون پیٹ کے اندر نہ جائے۔ (فتاوی دار العلوم:٦/۴۰٦، فتاوی شامی:۳/۳۲۷)

(۱۲) خود بہ خود قے، ڈکار یا کھانسی کے ساتھ پانی بلغم وغیرہ آجائے، خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے اور کتنی ہی مقدار میں آئے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر اپنے اختیار سے قے کی اور منہ بھر کر قے ہوگئی تو روزہ جاتا رہا، اور اگر اس سے تھوڑی ہو تو

خود قے کرنے سے بھی روزہ نہیں گیا، اسی طرح اگر تھوڑی سی قے آئی اور پھر خود بہ خود حلق میں لوٹ گئی تب بھی روزہ نہیں ٹوٹا لیکن اگر قصداً لوٹالی تو روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۲)

(۱۳) اگر منہ بھر کر قے آئی اور ایک چنے کے برابر یا اس سے زائد جان بوجھ کر واپس لوٹالی تو روزہ ٹوٹ گیا اور اگر جان بوجھ کر قے کی تو اس صورت میں روزہ فاسد ہوجائے گا، اگرچہ واپس نہ لوٹائے، البتہ منہ بھر کر قے نہ ہو تو روزہ نہیں ٹوٹتا (احسن الفتاوی:۴/۴۳۳)

(۱۴) ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے کلی کرنا، ناک میں پانی دینا، غسل کرنا کپڑا بھگو کر سر یا بدن پر لپیٹنا یا ڈالنا، جسم کے کسی حصے پر برف رکھنا، ان سب چیزوں سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ایک صحابی بیان فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عرج کے مقام پر دیکھا کہ آپ روزے کی حالت میں پیاس کی وجہ سے اپنے سر پر پانی ڈال رہے ہیں (ابوداؤد:۱/۳۲۱، رقم الحدیث:۵: ۲۳) اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر جسم کے اوپر پانی ڈالا جائے اور اس کا اثر جسم کے اندر پہنچے تو اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۲)

(۱۵) روزے کی حالت میں انجکشن لگوانے یا گلوکوز چڑھانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کے ذریعے کوئی بھی چیز بہ راہ راست معدے تک نہیں پہنچتی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ انجکشن یا گلوکوز کے ذریعے دوا یا غذا معدے تک پہنچائی جاتی ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ اسی لیے انجکشن اور گلوکوز کے ذریعے دی جانے والی دوا یا پانی کو کھانا پینا نہیں کہتے، روزہ اصل شئ کے پہنچنے سے ٹوٹتا ہے اس کا اثر پہنچنے سے نہیں ٹوٹتا ضرورت ہو تو روزہ دار مریض کو خون بھی چڑھایا جاسکتا ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۲۲)

(۱۶) روزے کی حالت میں ایسے علاج پر کوئی پابندی نہیں ہے جس سے دوا منہ کے ذریعہ نہ لینی پڑے، مثال کے طور پر اگر ضرورت ہو تو روزے کی حالت میں دانت نکلوایا جاسکتا ہے، بہ شرط یہ کہ دانت سے نکلنے والا خون پیٹ میں نہ جائے (احسن الفتاوی:۴/۴۲۶)

اسی طرح روزے کی حالت میں خون بھی ٹیسٹ کرایا جاسکتا ہے، کیوں کر روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں پچھنے لگوائے (بخاری: ۲/۶۸۵، رقم الحدیث: ۱۸۳۶، ابوداؤد: ۱/۲۳۷، رقم الحدیث: ۲۳۷۲) یعنی نشتر لگوا کر جسم کے کسی حصے سے فاسد خون باہر نکلوایا لیکن یہ دیکھ لینا چاہئے کہ خون نکلوانے سے جسم میں کم زوری تو پیدا نہیں ہوگی، کیوں کہ کم زوری سے روزہ توڑنا پڑسکتا ہے،(فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۹) بعض بیماریوں کا علاج دوا سونگھا کر یا چکھا کر کیا جاتا ہے اگر چکھنے والی دوا کا کوئی جز حلق کے اندر نہ جائے تو اس طریق علاج سے بھی روزہ متاثر نہیں ہوتا، البتہ اس طرح کا علاج شدید ضرورت کے وقت ہی کرانا چاہئے، کیوں کہ بہ ہر حال یہ اندیشہ موجود ہے کہ اگر دوا حلق کے اندر چلی گئی تو روزہ فاسد ہوجائے گا، جہاں تک سونگھنے کا تعلق ہے تو اسے عطر پر قیاس کیا جاسکتا ہے روزے کی حالت میں عطر سونگھنا بلا کراہت جائز ہے، یہ محض ہوا ہے جو اندر جاتی ہے جب تک ٹھوس چیز شامل نہ ہو محض ہوا کے اندر جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا (فتاوی شامی: ۳/۳۹۵) آکسیجن کو بھی اسی طرح کی ہوا پر قیاس کیا گیا ہے اس لیے اگر کسی مریض کی منہ کے یا ناک کے ذریعے آکسیجن دی گئی تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۳) البتہ آج کل دمہ کے مریضوں کو پاؤڈر کی شکل میں ایک دوا دی جاتی ہے اور پچکاری کے ذریعے اسے ناک میں داخل کیا جاتا ہے، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، کیوں کہ اگر دھواں جان بوجھ کر ناک کے ذریعے کھینچا جائے تو اس سے روزہ

ٹوٹ جاتا ہے (فتاوی شامی: ۳/۳۶۶) روزے کی حالت میں دل کا، پیٹ کا یا جسم کے کسی بھی دوسرے حصے کا آپریشن کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیوں کہ روزہ ایسی چیز سے ٹوٹتا ہے جو روزہ دار کے دماغ یا معدے تک پہنچ جائے، آپریشن وغیرہ میں یہ صورت نہیں ہے،(فتاوی قاضی خاں: ۲/۳۶۶) امراض کی شناخت کے لیے آدمی کے مقعد میں پائپ نما دوربین ڈالی جاتی ہے، اسے انڈوس کوپی کہتے ہیں اس طرح کے علاج سے بھی روزے کو کوئی نقصان نہیں ہے، کیوں کہ اس پائپ کے ذریعے کوئی دوا اندر داخل نہیں کی گئی بلکہ صرف معائنہ کیا گیا ہے (البحر الرائق: ۲/۴۸۷) زخموں پر مرہم لگانے یا سیال شئ ملنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا، البتہ اگر بواسیری مسوں پر مرہم لگایا اور یہ یقین ہے کہ مرہم کا کوئی حصہ جسم میں پہنچ گیا ہے تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اور اگر یقین نہیں محض شک ہے تو روزہ نہیں ٹوٹے گا (بدائع الصنائع: ۲/۹۳) آنکھ میں دوا ڈالنے سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا اگر چہ اس کا اثر حلق میں محسوس ہو (البحر الرائق: ۲/۴۷۷)

روزے میں کونسی چیزیں مکروہ ہیں:

بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ تو نہیں ٹوٹتا مگر مکروہ ہوجاتا ہے، روزہ دار کو چاہئے کہ وہ روزے کے مکروہات سے بھی پرہیز کرے۔ روزے میں کراہت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے ثواب کم ہوجاتا ہے، بعض صورتوں میں قانونی اعتبار سے روزہ تو ہوجاتا ہے مگر اس کا ثواب نہیں ملتا، بلکہ روزے میں اس طرح کے مکروہ کام کرنے سے گناہ الگ ملتا ہے، ذیل میں کچھ مکروہات لکھے جارہے ہیں، روزہ دار کو چاہئے کہ وہ ان مکروہات سے اجتناب کرنے کی کوشش کرے، اس سلسلے میں یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ جس چیز سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ ہو وہ مکروہ ہے، کچھ مکروہات ذیل میں درج ہیں۔

(۱) بلاضرورت کسی چیز کو منہ میں رکھ کر چبانا یا چکھ کر تھوک دینا (فتاوی عالمگیری:

۱/۱۹۹) ہاں ایسا کرنا اس صورت میں صحیح ہے اگر شوہر بد مزاج ہو اور بیوی کو سالن وغیرہ میں نمک مرچ کی کمی بیشی سے اس کی ناراضگی کا خوف ہو، یا بچہ اس قدر چھوٹا ہو کہ روٹی وغیرہ خود چبا کر نہ کھا سکے۔

(۲) اپنے منہ میں ارادتاً تھوک جمع کر کے نگلنا (فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۱)

(۳) بغیر شدید ضرورت کے جسم سے خون نکلوانا یا خون دینا، ویسے بھی بلا سخت ضرورت کے جسم میں خون چڑھانا جائز نہیں اور نہ نکلوانا جائز ہے، اگر کسی کی جان خطرے میں ہے اور خون دیئے بغیر جان بچنا مشکل ہے تو ایسی صورت میں خون دینا جائز بھی ہے اور خون چڑھوانا بھی جائز ہے، روزے کی حالت میں اگر کسی نے بلا ضرورت جسم سے خون نکلوایا یا خون چڑھوایا تو کراہت کے ساتھ روزہ تو ہو جائے گا مگر ناجائز کے ارتکاب کا گناہ ہوگا۔

(۴) لفافے پر لگے ہوئے گوند کو زبان سے تر کرنا کراہت سے خالی نہیں ہے، کیوں کہ اس میں چکھنے کا عمل شدید ضرورت کے بغیر پایا گیا ہے، گوند کو پانی سے یا انگلی پر تھوک لگا کر بھی تر کیا جا سکتا تھا، زبان سے تر کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، پھر اس میں یہ اندیشہ بھی ہے کہ گوند کے اجزاء حلق کے اندر چلے جائیں اور روزہ ٹوٹ جائے (فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۹)

(۵) روزے کی حالت میں بیوی کے ہونٹ چومنا خواہ نفس پر قابو ہو یا نہ ہو مطلقاً مکروہ ہے، دوسری جگہوں کا بوسہ بہ حالت روزہ لیا جا سکتا ہے اگر نفس پر قابو ہو لیکن اگر نفس پر قابو نہ ہو اور جماع کا اندیشہ ہو تو دوسری جگہوں کا بوسہ لینا بھی مکروہ ہے۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۰)

(۶) روزے کی حالت میں کوئی ایسا کام کرنا بھی مکروہ ہے جس سے اس قدر کمزوری ہو جائے کہ کسی وقت روزہ توڑنا پڑ جائے۔ (فتاوی شامی:۳/۳۵۷)

(۷) کلی کرنے میں اور ناک میں پانی ڈالنے میں بہت زیادہ مبالغہ کرنا بھی مکروہ ہے (فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۹) اسی طرح یہ بھی مکروہ ہے کہ روزہ دار دیر تک پانی کے اندر رہے یا دیر تک غسل کرتا رہے، یا پانی کے اندر کھیلتا رہے (فتاوی شامی:۳/۳۹۹)

(۸) کسی کو رات میں غسل کی ضرورت پیش آ جائے تو اسے صبح صادق سے پہلے غسل کر لینا چاہئے اسی طرح سحری کے بعد غسل کے وجوب کی صورت میں بھی جلد از جلد غسل کر لینا چاہیئے، بلا عذر غسل میں تاخیر کرنا باعث کراہت ہے (فتاوی شامی:۳/۳۹۸)

روزے کی حالت میں گناہوں سے بچیئے:

روزے کی حالت میں ہر طرح کے گناہوں سے اجتناب کرنا چاہئے، گناہوں سے روزہ مکروہ ہو جاتا ہے، اگرچہ گناہ کے باوجود روزہ ہو جائے گا مگر وہ اللہ کے یہاں بھی قبول ہوا یا نہیں یہ دیکھنے کی بات ہے، روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے بے ہودہ کلام یا بے ہودہ کام نہ چھوڑا اللہ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے (بخاری: ۵/۲۲۵۱، رقم الحدیث: ۵۷۱۰، ابوداؤد:۱/۷۲۰، رقم الحدیث:۲۳۶۲، ترمذی:۳/۸۷، رقم الحدیث:۷۰۷) ایک روایت میں ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں جنہیں بھوک پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا اور بہت سے راتوں کو جاگنے والے اور عبادت کرنے والے ایسے ہیں جنہیں جاگنے کی مشقت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا (ابن ماجہ:۱/۵۳۹، رقم الحدیث:۱۶۹۰) اس لیے روزہ داروں کو چاہئے کہ وہ غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بہتان تراشی بے ہودہ گوئی، ایذا رسانی سے، لڑائی جھگڑوں سے، مار پیٹ اور گالم گلوچ سے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں، اسی طرح فلمیں دیکھنا، گانے سننا، ٹی وی دیکھنا، فحش تصاویر دیکھنا یہ سب گناہ کے کام ہیں، عام دنوں میں بھی اس طرح کے کام کرنے کی ممانعت ہے

چہ جائے کہ رمضان جیسے مقدس ومحترم مہینے میں اور روزہ جیسی عبادت کے دوران یہ گناہ ہمارے ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ سے سرزد ہوں، ظاہر ہے جب اللہ نے اس مہینے کی برکت سے ثواب میں اضافہ کیا ہے تو اس کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس مہینے میں کیے جانے والا گناہ کا عذاب بھی معمولی درجے کا نہ ہو۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تم میں سے کوئی روزے سے ہو تو اسے بے ہودہ گوئی سے اور جہالت کے کاموں سے بچنا چاہئے، اور اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ جہالت سے پیش آئے تو اسے کہنا چاہئے کہ میں تو روزے سے ہوں (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۲۷۱، رقم الحدیث: ۸۸۷۹) روزے کی حالت میں غیبت کس قدر بڑا گناہ ہے اس کا اندازہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے لگایا جا سکتا ہے جس کے راوی حضرت انسؓ ہیں، فرماتے ہیں اس شخص کا روزہ ہی نہیں ہوا جو تمام دن لوگوں کے گوشت کھاتا رہا (مصنف ابن ابی شیبہ: ۲/۲۷۲، رقم الحدیث: ۸۸۹۰) حدیث کی کتابوں میں ایک بہت مشہور واقعہ مذکور ہے کہ دو عورتوں نے روزہ رکھا، کسی شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں دو عورتوں نے روزہ رکھا تھا اور اب وہ پیاس کی شدت سے مرنے کے قریب پہنچ چکی ہیں (سائل کے سوال کا مقصد یہ تھا کہ آیا وہ عورتیں روزہ پورا کریں یا پانی پی کر افطار کردیں راوی کہتے ہیں) آپ نے رُخ پھیر لیا، ایک روایت میں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خاموش رہے، اس شخص نے پھر یہی سوال دہرایا غالباً یہ دوپہر کا وقت تھا، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ دونوں عورتیں مر چکی ہیں یا مرنے والی ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ان دونوں کو بلا کر لاؤ راوی کہتے ہیں وہ دونوں عورتیں حاضر ہوئیں، ایک پیالہ یا کوئی دوسرا برتن لایا گیا اور ان دونوں میں سے ایک عورت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس میں قئے کرو، چنانچہ اس نے پیپ، خون یا گوشت کی قئے کی یہاں تک آدھا پیالہ بھر

گیا، پھر دوسری عورت سے ارشاد فرمایا کہ قئے کرو، اس نے بھی خون، پیپ اور تازہ گوشت وغیرہ کی قئے کی، یہاں تک کہ وہ پیالہ بھر گیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان عورتوں نے اللہ کی حلال کردہ چیزوں سے روزہ رکھا تھا اور حرام کردہ چیزوں سے افطار کرلیا، یہ دونوں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر لوگوں کا گوشت کھاتی رہیں (مسند احمد بن حنبلؒ: ۵/۴۳۱، رقم الحدیث: ۲۳۷۰۳)

بہ ہر حال جس طرح روزے کے ظاہری آداب کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اسے ان چیزوں سے بچایا جائے جن سے روزہ ٹوٹنے کا اندیشہ ہو یا مکروہ ہونے کا خطرہ ہو، اسی طرح روزے کے باطنی آداب کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں ہر برے کام سے اور بری بات سے خود کو محفوظ رکھے، ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور پھر تین چیزوں سے محفوظ رہا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ تین چیزیں کونسی ہیں فرمایا روزہ دار کی زبان، روزے دار کا پیٹ، اور روزہ دار کی شرم گاہ (کنز العمال: ۸/۵۸۰، رقم الحدیث: ۲۴۲۷۹)

روزہ کن چیزوں سے فاسد ہوتا ہے:

بہت سی صورتیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے، بعض صورتوں میں قضا واجب ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہوتے ہیں، قضا کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان گزرنے کے بعد ایک روزے کے بدلے میں ایک روزہ قضا کی نیت سے رکھا جائے۔ قضا روزوں کا مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے، اختیار ہے جب چاہے رکھے لیکن بہتر یہ ہے قضا روزوں کی ادائیگی میں جلدی کرے، کیوں کہ موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے، جتنی جلدی ادائیگی ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے، قضا

روزوں میں ترتیب بھی ضروری نہیں ہے اور نہ لگاتار رکھنے ضروری ہیں (علم الفقہ:۴۴۴، جواہر الفقہ:۱/۳۸۱) فوت شدہ روزے کی قضا کے لیے دن تاریخ متعین کرنا تو ضروری نہیں ہے بلکہ جتنے روزے قضا ہوئے ہوں اتنے روزے رکھ لینے چاہئیں، البتہ اگر کئی سالوں کے روزے باقی ہوں تو ادا کرتے ہوئے سال کا تعین کر لینا ضروری ہے (بہشتی زیور:۳/۷) اگر کسی وجہ سے سال گذشتہ کے رمضان کے روزے نہیں رکھے جاسکے تھے کہ دوسرا رمضان آگیا تو اب دوسرے رمضان کے فرض روزے پہلے ادا کرنے چاہئیں، قضا بعد میں رکھے جائیں (شرح البدایہ:۲/۲۰۴)

روزہ فاسد ہوگا صرف قضا واجب ہوگی:

ذیل میں کچھ ایسے مسائل درج ہیں جن میں روزہ تو فاسد ہو جاتا ہے مگر اس کی قضا کی جاتی ہے۔

(۱) ہر وہ چیز جس کو غذاءً، دواءً یا کسی فائدے کے لیے استعمال نہ کیا جاتا ہو جیسے پتھر مٹی وغیرہ اس کے کھانے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن صرف قضا واجب ہوتی ہے۔

(۲) روزے کی حالت میں اگربتی، لوبان وغیرہ کا دھواں جان بوجھ کر ناک میں داخل کرنے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، صرف قضا واجب ہوگی (فتاوی شامی:۳/۳۶۶)

(۳) روزہ یاد تھا مگر وضو کرتے ہوئے یا غسل کرتے ہوئے ویسے ہی پانی ناک میں ڈالتے ہوئے بلا قصد واختیار پانی حلق میں چلا گیا تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا، اسی لیے غسل اور وضو کرتے ہوئے روزے کی حالت میں غرغرہ سے منع کیا گیا ہے کیوں کہ اس میں پانی کے حلق میں چلے جانے کا اندیشہ ہے، اگر غرغرہ کر رہا تھا کہ پانی حلق میں نیچے تک داخل ہو گیا تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۲)

(۴) سحری کا وقت سمجھ کر صبح صادق کے بعد کھانے پینے سے روزہ فاسد

ہو جائے گا (فتاوی شامی:۳/۳۷۵) اسی طرح اگر کسی شخص نے غروب آفتاب سے پہلے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ آفتاب غروب ہو چکا ہے کچھ کھا پی لیا تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی دار العلوم:۶/۴۳۶)

(۵) اگر کسی شخص کے دانتوں میں گوشت کا ریشہ یا روٹی وغیرہ کا ریزہ لگا ہوا ہو اور وہ چنے کی مقدار سے بڑا ہو اس نے وہ ریزہ یا ریشہ دانتوں سے نکالے بغیر نگل لیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر کسی نے منہ سے باہر نکالا پھر نگلا تو اب وہ ریزہ یا ریشہ چنے کے برابر ہو یا نہ ہو ہر حالت میں روزہ فاسد ہو جائے گا (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ:۱/۹۳۳)

(۶) دانتوں سے نکل کر اتنا خون یا پیپ حلق کے اندر چلی جائے جو تھوک کے برابر یا اس سے زیادہ ہو اور برابر یا زیادہ ہونے کی پہچان یہ ہے کہ تھوک میں اس کی آمیزش صاف نظر آجائے اور منہ میں اس کا ذائقہ محسوس ہونے لگے تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی رحیمیہ:۳/۱۰۸) اگر روزے کی حالت میں مسوڑھوں کا خون یا پیپ وغیرہ حلق کے اندر چلی گئی تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا، چاہے سونے کی حالت میں حلق کے اندر گئی ہو یا بیداری کی حالت میں (فتاوی دار العلوم:۶/۴۱۴) روزے کی حالت میں داڑھ دانت نہ نکلوائے تو بہتر ہے، لیکن اگر درد کی شدت کے باعث نکلوانے کی ضرورت پیش آجائے تو یہ احتیاط کرنی چاہئے کہ خون حلق کے اندر نہ جائے، کیوں کہ اگر تھوک کے برابر یا زیادہ مقدار میں خون حلق کے اندر چلا گیا یا خون کا ذائقہ حلق کے اندر محسوس ہوا تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔ (احسن الفتاوی:۴/۱۰۷)

(۷) ناک میں دوا یا تیل ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا، خواہ کسی مجبوری ہی کی وجہ سے کیوں نہ ڈالے (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴) البتہ کان کے متعلق پہلے تو یہی فتوی دیا جاتا تھا کہ اگر کان میں دوا یا تیل وغیرہ ڈالا جائے تو اس سے روزہ ٹوٹ جاتا

ہے لیکن اب جدید طبی تحقیق کی وجہ سے بہت سے علماء یہ فتوی دینے لگے ہیں کہ کان میں دوا وغیرہ ڈالنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا اِلّا یہ کہ کسی شخص کے کان کا پردہ پھٹا ہوا ہو (ملاحظہ کیجئے: ماہ نامہ البلاغ کراچی، دسمبر ۲۰۰۱، ص:۴۹) لیکن احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک دار العلوم دیوبند جیسے مستند ادارے اس طرح کا فتوی نہ دیں اس وقت تک پرانے فتوے پر ہی عمل کیا جائے کہ کان میں دوا وغیرہ ڈالنے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے (فتاوی عالمگیری: ۱/۲۰۴)

(۸) سانس کے ذریعے کوئی ایسی چیز کھینچنا کہ وہ جوف دماغ میں یقینی طور پر پہنچ جائے جیسے وکس، انہیلر، سنتھول، ٹنکچر بینزائن وغیرہ یا خشک سفوف وغیرہ ناک کے ذریعے کھینچنا، یا ایسی آکسیجن دینا جس میں ادویات کے اجزاء شامل ہوں (خیر الفتاوی: ۴/۹۸) یہی حکم روزے کی حالت میں حقہ، بیڑی اور سگریٹ کا ہے، کیوں کہ ان میں بھی دھواں اندر کی طرف کھینچ کر باہر چھوڑا جاتا ہے، غالب امکان یہی ہے کہ اس طرح کرنے سے دھواں اندر ضرور جائے گا، اس سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا واجب ہوگی، لیکن اگر کسی شخص نے مفید سمجھ کر اور بھوک کے تدارک کے طور پر سگریٹ وغیرہ پی تو نہ صرف قضا واجب ہوگی بلکہ کفارہ بھی دینا پڑے گا (فتاوی دار العلوم: ۶/۴۱۹)

(۹) بیوی کے ساتھ بوس وکنار کرتے ہوئے یا خود لذتی کی وجہ سے انزال ہو جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی رحیمیہ: ۷/۲۶۲، خیر الفتاوی: ۴/۶۱، ۶۲) یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ صرف سوچنے یا خیال کرنے سے یا فحش تصاویر وغیرہ دیکھنے سے انزال ہونے کی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

(۱۰) بیماری یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے روزہ توڑا جا سکتا ہے، اس صورت میں صرف قضا واجب ہوگی، مثلاً کوئی شخص تیز بخار میں مبتلا تھا یا کسی شخص کو اس قدر پیاس محسوس ہوئی کہ معاملہ برداشت سے باہر ہوگیا تو روزہ توڑنے کی گنجائش ہے

(فتاوی دار العلوم: ۶/۴۲۶) اگر کسی بیمار نے روزہ رکھ لیا بعد میں کسی علامت سے تجربے سے یا کسی ماہر مسلمان ڈاکٹر کے کہنے سے پتہ چلا کہ اگر روزہ رہا تو مرض بڑھ جائے گا تو اس صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے، یہاں بھی قضا واجب ہوگی (فتاوی عالمگیری: ۱/۲۰۷) (۲) کسی حاملہ کو حمل ضائع ہونے یا اسے نقصان پہنچنے کا ڈر ہو یا دودھ پلانے والی عورت کو بچے کی ہلاکت کا خوف ہو تو ایسی عورتیں بھی روزہ توڑ سکتی ہیں، ان پر بھی قضا واجب ہوگی۔ (البحر الرائق: ۲/۴۹۹)

(۱۱) مجبوری کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو جان سے مارنے کی دھمکی دی جائے یا یہ کہا جائے کہ تمہارے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں گے، یا کوئی بہت بڑا نقصان پہنچا دیا جائے گا ایسی صورت میں روزہ توڑا جا سکتا ہے اس کی بھی صرف قضا واجب ہوگی اور روزہ توڑنے کا کوئی گناہ نہ ہوگا (فتاوی عالمگیری: ۱/۲۰۲)

(۱۲) اگر کوئی شخص رمضان کے مہینے میں بے ہوش رہا تو جس دن بے ہوشی طاری ہوئی اس دن کے علاوہ تمام دنوں کے روزوں کی قضا ضروری ہے، پہلے دن کا روزہ صحیح مانا جائے گا، پورے رمضان بے ہوش رہا تب بھی یہی حکم ہے ہوش میں آنے کے بعد تمام مہینے کے روزوں کی قضا ضروری ہے، البتہ پاگل کا حکم دوسرا ہے اگر کوئی شخص رمضان کے پورے مہینے جنون میں مبتلا رہا تو اس پر قضا واجب نہیں ہے، لیکن اگر کچھ دن صحیح رہا اور کچھ دن جنون میں گزرے تو تمام فوت شدہ روزوں کی قضا رکھنی ہوگی، جتنے روزے جنون کی وجہ سے گئے ہیں ان کی بھی قضا رکھی جائے گی۔ (علم الفقہ: ۴۳۷)

(۱۳) دل کا مریض اگر درد کی گولی زبان کے نیچے رکھ لے اور اس کا اثر تھوک میں شامل ہو کر حلق کے اندر چلا جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا لیکن اگر حلق کے اندر نہیں گیا تو روزہ نہیں ٹوٹے گا اگرچہ دوا زبان کے مسامات میں جذب ہو کر درد کو زائل کر دے۔

(۱۴) آج کل رحم وغیرہ کی صفائی کے لیے عورت کی شرمگاہ میں آلات وغیرہ ڈالے جاتے ہیں، اگر وہ آلات خشک ہوں تو ان کے داخل کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹے گا، لیکن اگر وہ تر ہوں یا ان پر دوا وغیرہ لگی ہوئی ہو تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا (فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۴) البتہ شرمگاہ میں دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا تاہم قضا واجب ہوگی (البحر الرائق:۲/۲۸۸)

(۱۵) کسی شخص کو خود بہ خود قئے ہوئی غلطی سے وہ یہ سمجھا کہ اس قئے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے، حالاں کہ اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یہ سوچ کر اس نے کھانا پینا شروع کر دیا تو اس روزے کی قضا واجب ہوگی۔ (فتاوی ہندیہ:۱/۲۰۶)

ایک قابل توجہ مسئلہ:

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اگر کسی شخص کا روزہ چھوٹ جائے یا فاسد ہو جائے تو قضا خود ہی کرے گا، کسی دوسرے شخص کے ذریعے قضا کرانا جائز نہیں ہے اس سلسلے میں شریعت کا یہ اصول ہے کہ عبادات بدنیہ مثلاً نماز، روزہ اگر فوت ہو جائیں تو اس میں نیابت کی گنجائش نہیں ہے، خود ہی قضا کرنی ضروری ہوگی، البتہ مالی عبادتوں میں جیسے زکوۃ اور صدقۂ فطر وغیرہ دوسرا بھی ادا کر سکتا ہے (فتاوی شامی:۲/۱۴۳)

قضاء کے کچھ مسائل:

اگر کوئی مسافر دن ڈھلے مقیم ہو جائے، کسی عورت کا حیض ونفاس دن کے کسی بھی حصے میں بند ہو جائے، کوئی بیمار دن ڈھلے صحت یاب ہو جائے، کسی نے مجبوری کی وجہ سے روزہ توڑ ڈالا ہو اور دن ڈھلنے کے بعد اس کی مجبوری دور ہو گئی ہو تو ان سب کو چاہئے کہ وہ روزہ داروں کی طرح باقی دن گزاریں اور رمضان کے بعد اس دن کے روزے کی قضا کریں، البتہ اگر کوئی نابالغ بچہ دن میں بالغ ہو گیا ہو یا کوئی کافر دن میں اسلام لے آیا ہو تو ان دونوں پر قضا واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ان پر یہ روزہ فرض ہی نہیں ہوا تھا۔

جن صورتوں میں قضا اور کفارہ دونوں واجب ہیں:

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ رمضان کا روزہ ایک لازمی فرض ہے، اگر کسی شخص نے جس پر رمضان کے روزے فرض تھے جان بوجھ کر روزے کی حالت میں کوئی غذا کھالی یا پانی پی لیا، یا جماع کر لیا تو اس سے روزہ بھی فاسد ہو جائے گا، قضا بھی ضروری ہوگی اور کفارہ بھی دینا ہوگا، اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ بلا عذر رمضان کا روزہ چھوڑنے والا شدید وعید کا مستحق ہے، ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص جان بوجھ کر رمضان کا ایک روزہ چھوڑ دے تو پھر وہ پوری عمر بھی روزے رکھے تب بھی اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتا (بخاری:۳/۶۸۲، ابوداؤد:۱/۷۲۹، رقم الحدیث: ۲۳۹۶) اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رمضان کے روزے کی کتنی اہمیت اور فضیلت ہے، ظاہر ہے جس کام کے کرنے پر ثواب زیادہ ہوگا اس کے نہ کرنے پر عذاب بھی اتنا ہی ہوگا، اور اگر رکھ کر توڑ دیا تو یہ انتہائی قابل مذمت ہے اس کی قیامت کے دن کتنی سزا ہوگی اور کیا ہوگی یہ تو اللہ ہی جانتا ہے، لیکن دنیا میں بھی اس کی سزا اتنی ہونی چاہئے کہ وہ خود بھی روزہ توڑنے کی جرأت نہ کر سکے اور دوسروں کو بھی جسارت نہ ہو، اسی لیے جان بوجھ کر روزہ توڑنے والوں کے لیے قضا بھی ہے اور کفارے کی سزا بھی ہے۔

کفارہ کیا ہے؟

روزے کا کفارہ یہ ہے کہ ایک روزے کے بدلے میں ایک غلام آزاد کرے اگر کسی شخص کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے کہ وہ غلام خرید کر آزاد کر سکے یا کسی ایسی جگہ رہتا ہو جہاں غلاموں کی خرید وفروخت نہ ہوتی ہو تو ایسے شخص کے لیے ساٹھ روزے رکھنا واجب ہے، اگر کسی وجہ سے ساٹھ روزے بھی نہ رکھ سکے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا واجب ہے، ساٹھ روزوں میں شرط یہ ہے کہ ان میں تسلسل ہو، بیچ میں کوئی انقطاع نہ

ہو، یعنی کوئی روزہ ناغہ نہ ہو، اگر ناغہ ہوگیا تو تمام ساٹھ کے ساٹھ روزے دوبارہ رکھے ہوں گے، ہاں اگر کسی عورت کو حیض آجائے تو یہ ناغہ معاف ہوگا حیض کے ایام پورے ہونے کے بعد باقی روزے پورے کئے جائیں، اگر کوئی شخص کفارے کی تینوں صورتوں پر قادر ہو یعنی غلام بھی آزاد کرسکتا ہو، ساٹھ روزے بھی رکھ سکتا ہو اور ساٹھ مسکینوں کو کھانا بھی کھلا سکتا ہو تو جو صورت اس کے لیے زیادہ سخت ہو وہ اختیار کی جائے اس لیے کہ کفارے کا مقصد سزا اور تنبیہ ہے، صاحب ''البحر الرائق'' نے لکھا ہے کہ اگر بادشاہ پر کفارہ واجب ہوجائے تو اسے ساٹھ روزے رکھنے چاہئیں کیوں کہ اس کے لیے یہ عمل دشوار ہوگا، وہ غلام بھی آسانی کے ساتھ آزاد کرسکتا ہے اور ساٹھ مسکینوں کو بھی سہولت سے کھانا کھلا سکتا ہے، مسکینوں کو کھانا کھلانے کے سلسلے میں یہ شرط ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے، چاہے ایک ہی دن دونوں وقت کھلا دیں، چاہے دو دن دو وقت کھلا کر ایک دن پورا کردیں، ایک وقت میں جن محتاجوں کو کھانا کھلایا ہے دوسرے وقت بھی ان ہی کو کھلانا ہوگا یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک وقت میں ساٹھ مسکینوں کو کھلایا اور دوسرے وقت میں دوسرے ساٹھ مسکینوں کو کھلا دیا ہاں یہ ممکن ہے کہ ساٹھ روز تک ایک ہی مسکین کو کھانا کھلائے، یا ساٹھ دن نئے مسکین کو کھانا کھلائے، جن محتاجوں کو کھانا کھلائے ان کا بھوکا ہونا بھی ضروری ہے، پیٹ بھروں کو کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا، کھانے کے بجائے دو وقت کے کھانے کے بہ قدر ساٹھ مسکینوں کو صدقہ بھی دیا جاسکتا ہے، لیکن اگر ایک ہی شخص کو ایک ہی روز ساٹھ مسکینوں کے دو وقت کے کھانے کے بہ قدر صدقہ دے دیا تو یہ صورت بھی صحیح نہیں ہے، جماع کی سزا اور بھی سخت ہے، اگر جماع کے علاوہ کسی اور سبب سے کفارہ واجب ہوا اور ابھی وہ ادا نہیں کر پایا تھا کہ دوسرا واجب ہوگیا تو ان دونوں کے لیے ایک ہی کفارہ کافی ہے، خواہ دونوں کفارے دو رمضان کے ہوں، لیکن اگر جماع سبب بنا ہے

تو ہر روزے کا کفارہ الگ ہوگا (علم الفقہ: ۴۴۲)

جن صورتوں میں قضا و کفارہ دونوں واجب ہیں:

(۱) جان بوجھ کر ایسی چیز کھا پی لینا جس کو غذا، دوا یا کسی جسمانی فائدے کی غرض سے استعمال کیا جاتا ہے۔ (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۰۵، فتاوی شامی: ۳/ ۳۷۶ فتاوی دار العلوم: ۶/ ۴۲۹)

(۲) روزہ یاد ہونے کے باوجود ہم بستری کرنا چاہے انزال ہو یا نہ ہو، مسئلہ معلوم ہو یا نہ ہو ہر حالت میں کفارہ اور قضا دونوں لازم ہوں گے، لواطت کا بھی یہی حکم ہے (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۰۵، فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۶)

(۳) جان بوجھ کر روزے کی حالت میں سگار، بیڑی سگریٹ اور حقہ وغیرہ پینا بہ شرطیکہ عام دنوں میں ان چیزوں کا عادی ہو اور کسی فائدے کے پیش نظر پی رہا ہو تو اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ (فتاوی شامی: ۳/ ۳۶۶)

(۴) روزے کی حالت میں کسی کا تھوک منہ میں لے کر نگل لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جائے گا اور قضا کے ساتھ کفارہ بھی دینا ہوگا (فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۶ فتاوی دار العلوم: ۶/ ۴۳۳)

(۵) جان بوجھ کر کچے چاول، یا کچا گوشت کھانے کا بھی یہی حکم ہے، اس صورت میں بھی قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔ (فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۷ فتاوی دار العلوم: ۶/ ۴۴۱)

(۶) بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان سے روزہ نہیں ٹوٹتا مگر روزہ دار لاعلمی کی وجہ سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس کا روزہ ٹوٹ گیا، مثلاً کوئی روزہ دار ٹیسٹ کرانے کے لیے خون نکلوائے اور یہ سمجھے کہ اس عمل سے اس کا روزہ ٹوٹ گیا، اس کے بعد وہ عمداً کھانا پینا شروع کردے تو اس پر قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے، یہی حکم ان تمام

صورتوں میں ہوگا جن میں کسی شخص نے اس غلط فہمی میں کھانا پینا شروع کردیا کہ اس کا روزہ ٹوٹ چکا ہے حالاں کہ اس کا روزہ باقی تھا، مثلاً کسی شخص کو مسواک کرکے یہ خیال آیا کہ میرا روزہ ختم ہوگیا یا کسی کی غیبت کرکے یہ خیال ہوا کہ اب روزہ باقی نہیں رہا، ان صورتوں میں کھانے پینے سے روزہ کی قضا اور کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔(فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۶)

(۶) زبردستی جماع میں مرد پر بہر صورت قضا و کفارہ دونوں ہیں، اور اگر عورت راضی نہیں تھی اس کے ساتھ زبردستی کی گئی تب قضا ہے کفارہ نہیں، اور اگر ابتدا میں راضی نہیں تھی اور بعد میں راضی ہوگئی تب اس پر قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے۔(فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۵)

کفارے کے کچھ اہم مسائل:

(۱) اگر کسی نے چاند کے حساب سے کفارے کے روزے شروع کئے تو دو ماہ پورے کرے چاہے دونوں چاند ۲۹/ ۲۹/ کے ہوں، یا ایک ۲۹/ اور ایک تیس کا یا دونوں ۳۰/ ۳۰، کے ہوں، پہلی صورت میں ۵۸، دوسری صورت میں ۵۹، اور تیسری صورت میں ۶۰، روزے ہوں گے اور تینوں صورتیں صحیح ہوں گی، البتہ اگر چاند کی پہلی تاریخ سے روزوں کا آغاز نہیں کیا بلکہ کسی انگریزی تاریخ کو رکھنے شروع کئے تو اب ساٹھ روزے مکمل کرنے ہوں گے، البتہ اگر کسی نے ۱۵/ قمری تاریخ سے روزے شروع کئے درمیان میں ایک چاند کا مہینہ انتیس کا تھا، اب بعد والے مہینے میں ۱۵/ روزے رکھ کر کفارہ مکمل ہو جائے گا حالاں کہ یہ انسٹھ روزے ہوں گے۔ (فتاوی شامی:۵/۱۴۰، احسن الفتاوی:۴/۴۵۰)

(۲) کفارے کے روزوں میں تسلسل ضروری ہے یعنی ایک سے ساٹھ تک مسلسل روزے رکھے بیچ میں کوئی ناغہ نہ ہو، اور اگر ناغہ ہوگیا تو تمام روزے ازسرنو

رکھنے ہوں گے، البتہ کھانا کھلانے میں تسلسل ضروری نہیں، اگر ساٹھ دن تک مسلسل کھانا نہیں کھلایا بلکہ بیچ میں کچھ دن چھوٹ گئے تو کوئی حرج نہیں ہے، متفرق ایام میں کھلانے سے کفارہ ادا ہو جاتا ہے۔(فتاوی شامی:۵/۱۴۱، احسن الفتاوی:۴/۴۴۰)

(۳) کفارہ صرف رمضان کے روزوں کے ساتھ خاص ہے، دوسرے دنوں کے روزے رکھ کر توڑ دینے سے قضا واجب ہوگی کفارہ نہیں، اسی طرح کفارہ صرف اس روزے کا ہوگا جس کی نیت کر لی گئی تھی، اگر کسی نے روزہ ہی نہیں رکھا تھا یعنی نیت ہی نہیں کی تھی تو اس پر کفارہ نہیں ہے(فتاوی عالمگیری:۱/۱۹۵))

(۴) کھانا کھلانے کا نمبر جب آئے گا جب کسی شخص کے اندر ساٹھ روزے رکھنے کی طاقت نہیں ہوگی، اگر کوئی شخص ساٹھ روزے رکھ سکتا ہے تو اس کے لیے یہی صورت اختیار کرنی ضروری ہے، ورنہ کفارہ ادا نہیں ہوگا اگر روزے رکھنے کی طاقت نہیں ہے تب ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت کھانا کھلا سکتا ہے(فتاوی عالمگیری:۱/ ۲۰۷)

(۵) جن غریبوں کو کھانا کھلایا جائے ان میں یہ خیال رہے کہ وہ نابالغ چھوٹے بچے نہ ہوں، ان کو کھلانے سے کفارہ ادا نہیں ہوگا بلکہ یا تو بالغ ہوں یا قریب البلوغ ہوں، ہاں اگر ان کو کفارے کی مقدار کا مالک بنا دیا جائے تب کفارہ ادا ہو جائے گا(فتاوی شامی:۵/۱۴۴، فتاوی دارالعلوم:۴/ ۴۴۸)

(۶) اگر کوئی شخص کفارے میں کھانا نہ کھلا سکے بلکہ ساٹھ مسکینوں کو غلہ دیدے یا اس کی قیمت دے دے تب بھی کفارہ ادا ہو جائے گا، ساٹھ مسکینوں کے بجائے اگر ایک ہی مسکین کو ساٹھ دن تک غلہ دیتا رہا تب بھی کفارہ صحیح ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن میں ایک غریب کو ایک روزے کے بدلے ایک ہی دفعہ دیا جائے گا۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۳۱۲-۳۱۴، فتاوی دارالعلوم:۶/ ۴۵۱)

(۷) ہر مسکین کو غلہ دینا ہو تو صدقۂ فطر کی مقدار دی جائے گی، یا اس کی قیمت دینی ہوگی۔ (فتاوی شامی: ۳/۱۴۴)

(۸) روزے کا کفارہ ہر حال میں دینا ہوگا، محض توبہ سے کام نہیں چلے گا، اگر ساٹھ روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت کھانا کھلائے، اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو انتظار کرے، جب بھی استطاعت ہو کفارہ ادا کرے اور اس درمیان توبہ واستغفار کرتا رہے۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/۴۵۴)

(۹) اگر کسی نے ایک ہی رمضان میں کئی روزے جان بوجھ کر توڑ ڈالے ہوں تو سب کا ایک ہی کفارہ ہوگا اور دو رمضانوں کے متعدد روزے ہوں تب بھی صحیح قول یہی ہے کہ اگر جماع کے علاوہ کسی دوسرے سبب سے روزے توڑے ہوں تو ایک کفارہ ہوگا اور اگر جماع سبب ہو تو ہر رمضان کا کفارہ الگ ہوگا۔ (البحر الرائق: ۲/۴۸۴، احسن الفتاوی: ۴/۴۲۴)

جن صورتوں میں روزہ توڑ دینا جائز ہے:

(۱) اگر کوئی شخص روزہ رکھنے کے بعد اچانک اتنا سخت بیمار ہوا کہ اگر روزہ نہ توڑا تو بیماری بڑھ جائے گی، یا جان خطرے میں پڑ جائے گی، مثلاً کسی کو شوگر ہے روزہ رکھنے کے بعد اچانک شوگر میں اضافہ ہو گیا، یا اچانک پیٹ میں شدید درد اٹھا اور ناقابل برداشت ہو گیا یا کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی جس کا فوری علاج کرانا ضروری ہے ورنہ مرض بڑھ جائے گا اور جان کے لالے پڑ جائیں گے، ایسی صورت میں روزہ توڑنا جائز ہے (فتاوی عالمگیری: ۱/۲۰۷، احسن الفتاوی: ۴/۴۲۲)

(۲) اگر روزہ رکھنے کے بعد کسی کو زبردستی روزہ توڑنے پر مجبور کیا گیا اور اسے یہ یقین ہے کہ اگر اس نے روزہ نہیں توڑا تو دھمکی دینے والے اسے جان سے مار سکتے ہیں، یا اس کا کوئی عضو کاٹ سکتے ہیں یا بہت زیادہ مار پیٹ کر سکتے ہیں تو ایسی صورت

میں روزہ توڑنے کی اجازت ہے۔ (فتاوی شامی: ۳/۴۰۲)

جن صورتوں میں روزہ توڑ دینا جائز ہے ان میں صحت یاب ہونے اور معذوری ختم ہونے کے بعد روزہ ادا کرنا ضروری ہے، ایک روزے کے بدلے ایک روزہ رکھا جائے گا، مجبوری کی حالت میں توڑے گئے روزے پر کفارہ نہیں ہے۔

رمضان کا روزہ نہ چھوڑیئے نہ توڑیئے:

رمضان کا روزہ ایک بڑا فرض بھی ہے، ایک اہم سعادت بھی ہے اور ایک عظیم نعمت بھی ہے، بڑے بدنصیب ہیں وہ لوگ جو رمضان کا روزہ چھوڑ دیتے ہیں یا رکھ کر توڑ دیتے ہیں، اس طرح وہ فرض ترک کرنے کے گنہگار تو ہوتے ہی ہیں، سعادت اور نعمت سے محروم رہنے کے سزاوار بھی ہو جاتے ہیں، بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ معمولی معمولی بیماریوں کی وجہ سے یا تھوڑے بہت مشقت کے کام کی وجہ سے روزہ چھوڑ دیتے ہیں، رمضان کے بعد کم ہی لوگوں کو یہ روزہ رکھنے کی توفیق میسر آتی ہے، اور اگر کسی نے قضا بھی کر لیا تو جو اجر وثواب رمضان کے روزے کا تھا وہ کہاں میسر ہوگا، اگر واقعی کوئی شرعی عذر ہے تو بے شک روزہ چھوڑ سکتے ہیں، لیکن جان بوجھ کر روزہ چھوڑنا سخت گناہ ہے اور رکھ کر توڑ دینا تو اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ کتنے ہی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں تو بڑے بہادر اور جفاکش نظر آتے ہیں لیکن جہاں روزوں کی بات آئی کم ہمتی کا شکار ہو جاتے ہیں، ایسے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ روزہ رکھ کر بھوک پیاس برداشت نہ کر سکیں گے اور بیمار پڑ جائیں گے، ان کا یہ خیال غلط ہوتا ہے، روزہ رکھ کر کوئی بیمار نہیں پڑتا، طب جدید تو یہ کہتی ہے کہ روزہ انسانی صحت کے لیے ضروری ہے، اور چند گھنٹے خالی پیٹ رہ کر بہت سے ایسے جسمانی فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں جو قیمتی سے قیمتی دواؤں سے حاصل نہیں ہوتے، ایسے لوگوں میں قوت ارادی کی کمی ہوتی ہے اور حوصلہ نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو بوڑھوں اور کم عمر

بچوں سے سبق لینا چاہئے کہ وہ کس طرح روزہ رکھ رہے ہیں، بہت سے نوجوان تعلیم کا بہانہ بنا کر یا کھیلوں میں حصہ لینے کا عذر پیش کر کے روزہ ترک کر دیتے ہیں کہ پڑھائی سخت ہے، روزے میں نہیں ہو پائے گی، یا امتحان کی تیاری روزے میں نہیں ہو پائے گی، یہ صرف نفس کے بہانے ہیں، ان بہانوں سے روزہ معاف نہیں ہو سکتا، گرمی کے روزے تو بعض لوگوں کے لیے موت کے پیغام سے کم نہیں ہوتے، تصور ہی سے ان کی روح کانپ اٹھتی ہے، ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ گرمی کے روزوں سے کس طرح پیچھا چھڑائیں، ان میں سے بعض افراد اس خیال سے رمضان کے روزے چھوڑ دیتے ہیں کہ سردی میں رکھ لیں گے، قضا تو آپ کر لیں گے، لیکن جان بوجھ کر روزے نہ رکھنے کا جو گناہ ہوگا اس کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے، آج کل تو بڑی سہولتیں ہیں پنکھے، کولر، اے سی سب کچھ موجود ہے، اس وقت کا تصور کیجئے جب موسم بھی سخت ہوتا تھا اور موسم کی سختی سے بچاؤ کے وسائل بھی میسر نہیں تھے، لوگ سروں پر گیلے کپڑے رکھ کر، یا تربوز کے خول رکھ کر روزہ پورا کرتے تھے، اللہ کے نیک بندے تو حالت سفر میں بلکہ حالت جنگ میں بھی روزے نہیں ترک کرتے تھے، جب کہ شریعت نے سفر اور جنگ دونوں موقعوں پر روزہ نہ رکھنے کی سہولت دی ہے، لیکن وہ لوگ رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کر کے زیادہ سے زیادہ ثواب کما لینا چاہتے تھے، جب کہ آج کے لوگ روزہ چھوڑنے کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

مال دار آدمی یہ سوچتے ہیں کہ ہم روزہ نہیں رکھتے بلکہ فدیہ دیے دیں گے ہمیں ثواب مل جائے گا، غریبوں کا بھلا ہو جائے گا، یہ بڑی غلط فہمی ہے، ہٹے کٹے صحت مند لوگوں کے فدیہ دینے سے روزہ ادا نہیں ہوتا، یہ گنجائش تو انتہائی ضعیف لوگوں کے لیے ہے، غریبوں کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے تو انہیں فدیئے کے بجائے امداد کیوں نہیں دیتے، رمضان کی مبارک ساعتوں میں یوں بھی ایک کا ستر گنا ملنے والا ہے

روزہ رکھئے اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ رکھئے، احساس ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ اسے عبادت سمجھ کر انجام دیجئے، اور یہ سوچئے کہ اللہ ہماری ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہے، جس طرح ہم نماز میں خدا کے حضور حاضر ہوتے ہیں اسی طرح روزے کی حالت میں بھی ہم باری تعالی کی توجہات کا مرکز بنے ہوئے ہیں، اگر یہ احساس ذمہ داری ہوا تو ہمارے روزے صحیح معنی میں روزے ہوں گے، نہ ان میں گناہوں کی آمیزش ہوگی اور نہ روزوں کے درمیان ہم سے ایسی غلطیاں سرزد ہوں گی جو ہمارے روزوں کو مکروہ کر دیتی ہیں، بلکہ بعض اوقات ان غلطیوں کی وجہ سے ہمارا روزہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔

شریعت طاقت سے زیادہ کسی کو مکلف نہیں کرتی، یہ ایک ایسا اصول ہے جو ہمیں تمام عبادات میں موجود ملتا ہے، روزہ رکھنے والوں کو بھی اگر واقعی کوئی عذر ہے تو روزہ چھوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، فقہاء نے شرعی مجبوریوں کی تفصیلات بیان کر دی ہیں، اگر ان میں سے کوئی مجبوری پیش آ گئی ہے تو شریعت نے روزہ چھوڑنے کی اجازت دی ہے، وہ شرعی اعذار حسب ذیل ہیں۔

(۱) بیماری (۲) سفر (۳) اکراہ (زبردستی) (۴) حمل (۵) ارضاع (دودھ پلانا) (۶) ناقابل برداشت بھوک پیاس (۷) حیض ونفاس (۸) بڑھاپا۔

ان میں سے کچھ اعذار کی تفصیل گزر چکی ہے، کچھ ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

خواتین کا روزہ:

خواتین کا روزہ بھی ایسا ہی ہے جیسے مردوں کا روزہ، البتہ ان کے ساتھ جو مستقل اعذار ہیں ان کی بنا پر شریعت نے ان کے لیے کچھ سہولتیں رکھی ہیں، خواتین ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں، بعض صورتوں میں تو ان کے لیے روزہ رکھنا ہی

جائز نہیں ہے، عورتیں اس کا بھی خیال رکھیں، ذیل میں عورتوں کے کچھ مخصوص مسائل درج ہیں۔

(۱) حیض کے دوران نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا درست نہیں ہے ان دونوں عبادتوں میں فرق یہ ہے کہ ان ایام کی نماز بالکل معاف ہے، جب کہ روزہ معاف نہیں ہے، رمضان کے بعد ایام حیض کے روزوں کی قضا کرنی ہوگی۔
(فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۰۷)

(۲) بچے کی پیدائش کے بعد جو خون آتا ہے اسے نفاس کہتے ہیں، نفاس والی عورت کے سلسلے میں بھی یہی حکم ہے کہ اس کی نماز تو معاف ہے، لیکن روزہ معاف نہیں ہے، پاک ہو کر فوت شدہ روزوں کی قضا رکھنی پڑے گی۔ (فتاوی شامی: ۱/ ۴۹۶)

(۳) روزہ رکھنے کے بعد دن میں کسی وقت حیض آ گیا تو روزہ ٹوٹ جائے گا بعد میں قضا کرے گی (فتاوی شامی: ۱/ ۴۸۵)

(۴) اگر حائضہ عورت دن میں پاک ہو گئی تو اس کے لیے باقی تمام دن کھانا پینا درست نہیں ہے، روزہ داروں کی طرح رہنا واجب ہے، لیکن یہ روزہ نہیں ہوگا محض رمضان کے احترام کی وجہ سے اس کو کھانے پینے سے روکا گیا ہے (بہشتی زیور: ۳/ ۱۱)

(۵) جو عورت حمل سے ہو اگر اس کو یہ خوف ہو کہ روزہ رکھنے سے اس کی صحت کو نقصان پہنچے گا یا بچے کو نقصان ہوگا تو اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے، اگر کسی کو روزہ رکھنے کے بعد حمل کا احساس ہوا تب بھی روزہ توڑا جا سکتا ہے، دونوں صورتوں میں قضا ضروری ہے۔ (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۰۷)

(۶) اگر کوئی عورت بچے کو دودھ پلا رہی ہو خواہ بچہ اس کا ہو یا کسی دوسرے کا ہو، اجرت پر پلا رہی ہو یا بہ غیر اجرت کے اس کے لیے روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن اسے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس حالت میں روزہ رکھنے سے اس کی صحت متاثر ہوگی

یا نہیں، اور اس کے روزے رکھنے سے بچے کے دودھ میں کمی واقع ہوگی یا نہیں، اگر تجربے سے یا ڈاکٹر کے مشورے سے یہ بات سامنے آئے کہ دودھ پلانے کی حالت میں دونوں کو یا کسی ایک کو نقصان ہے تو روزہ چھوڑا جا سکتا ہے، بعد میں قضا ہوگی۔
(فتاوی شامی: ۳/ ۴۰۳)

اگر آپ سفر میں ہوں:

سفر کی حالت میں آپ کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، مگر واپسی کے بعد اس روزے کی قضا لازمی ہے، سفر کے سلسلے میں یہ شرط بھی ہے کہ وہ سفر شرعی ہو یعنی اتنے فاصلے کا ہو کہ اس کو شریعت سفر تسلیم کرتی ہو تب یہ سہولت حاصل ہوگی، سفر کی حالت میں نماز تو آدھی ہو جاتی ہے، لیکن روزہ واپسی کے بعد پورا ہی رکھنا پڑتا ہے، شرعی سفر کی مسافت اڑتالیس میل ہے، اس سے کم پر سفر کا اطلاق نہیں ہوگا، اڑتالیس میل انگریزی سوا ستتر کلو میٹر ہوتا ہے (کفایۃ المفتی: ۳/ ۳۵۳) اگر آپ رمضان کے مہینے میں سفر کر رہے ہوں تو حسب ذیل امور کا خیال رکھیں۔

(۱) سفر کیسا بھی ہو، خواہ جائز ہو یا ناجائز، دشوار گزار ہو یا آسان، پیدل ہو یا سواری کا، ریل کا ہو یا کار اور ہوائی جہاز کا ہر حال میں مسافر کے لیے روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ سفر کی حالت میں روزہ قضا نہ کرے، قرآن کریم میں ہے: وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرة: ۱۸۴) "اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے" اب یہ خود مسافر کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ روزے کی حالت میں سفر کر سکتا ہے یا نہیں، یا روزہ رکھ کر سفر کرنے میں اسے مشقت تو پیش نہیں آئے گی، ویسے تو آج کل سفر بڑے آرام دہ ہو گئے ہیں، خاص طور پر ہوائی جہاز اور ریل کے سفر میں تو کتنی ہی مسافت کیوں نہ طے کر لی جائے مشقت اور تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ رمضان کی فضیلت حاصل کرنے کے

لیے روزہ رکھا جائے، ہاں اگر سحر وافطار کی سہولت میسر نہ ہو تو روزہ قضا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (فتاوی شامی:۳/۴۰۵، فتاوی دار العلوم:۶/۴۷۲)

(۲) سفر کے دوران اگر کسی جگہ پر پندرہ دن سے کم ٹھہرنا ہے تو یہ تمام دن سفر کے شمار ہوں گے، لیکن اگر نیت پندرہ دن یا اس سے زائد کی ہے تو اب وہ شخص مسافر نہیں رہا بلکہ مقیم بن گیا، اس کے لیے روزے رکھنا ضروری ہے، ہاں اگر کوئی شخص مسلسل سفر میں ہے، کچھ دن ٹھہرتا ہے آگے بڑھ جاتا ہے، کسی ایک جگہ پندرہ دن قیام نہیں رہتا تو ایسا شخص مسافر سمجھا جائے گا چاہے کتنے ہی دن کیوں نہ گزر جائیں ایک دن کا سفر بھی سفر ہی مانا جائے گا اور روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی۔
(معارف القرآن:۱/۴۴۴)

(۳) اگر کوئی شخص صبح صادق سے پہلے سفر کے لیے نکل پڑے تو اس کے لیے روزہ چھوڑنا درست ہے، لیکن اگر کوئی شخص صبح صادق کے بعد سفر کے لیے نکلے تو اسے اس دن کا روزہ رکھنا چاہئے، لیکن اگر اس نے سفر شروع کرنے کے بعد روزہ توڑ ڈالا تو اس کی قضا ہوگی کفارہ نہیں ہوگا۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۲۷)

(۴) اگر کسی نے روزے سے بچنے کے لیے سفر کا حیلہ اختیار کیا تو اگر چہ اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہوگا مگر اس کا یہ حیلہ اختیار کرنا قابل مذمت فعل شمار ہوگا (فتاوی دار العلوم:۶/۴۹۴)

فدیہ کے مسائل:

(۱) فدیہ کے متعلق عام لوگوں میں یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ کوئی بھی شخص فدیہ دے کر روزے سے بچ سکتا ہے، فدیہ دینا ایک مخصوص حکم ہے جو مخصوص حالت اور مخصوص لوگوں کے لیے ہے، یعنی ہر شخص کو فدیہ دینے کی سہولت نہیں دی گئی ہے بلکہ فدیہ ایسا بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت دے سکتی ہے جو بڑھاپے اور ضعف کے باعث

روزے رکھنے پر بالکل بھی قادر نہ ہوں اور اب ان میں طاقت آنے کی امید بھی نہ ہو گویا جو لوگ زندگی کے آخری مرحلے میں ہوں اور جسمانی طاقت وقوت کھو چکے ہوں صرف ایسے عمر رسیدہ مردوں اور عورتوں کے لیے اجازت ہے کہ وہ روزے کا فدیہ ادا کردیں۔ (فتاوی دار العلوم:۶/۴۷۱)

(۲) فدیہ کی شرعی مقدار صدقۂ فطر کے برابر ہے، صدقۂ فطر کا نصاب موجودہ پیمانے میں ایک کلو پانچ سو چوہتر گرام چھ سو چالیس ملی گرام گیہوں ہے، اگر کوئی شخص گیہوں کے بجائے نقد دینا چاہے تو دے سکتا ہے اسی طرح کسی غریب کو صبح وشام پیٹ بھر کر کھانا کھلانے سے بھی فدیہ ادا ہو جائے گا۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۳۱)

(۳) رمضان آنے سے پہلے فدیہ دینا درست نہیں ہے، کیوں کہ یہ روزے کا بدل ہے، اور روزہ رمضان کے آنے پر واجب ہوتا ہے، اس لیے رمضان سے پہلے دینا درست نہیں ہے، البتہ رمضان کے شروع میں باقی تمام دنوں کا فدیہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ (فتاوی شامی:۳/۴۱۰، احسن الفتاوی:۴/۴۳۱)

(۴) فدیہ ادا کرنے کے بعد اگر کوئی شخص روزہ رکھنے پر قادر ہوگیا تو اب اس کا دیا ہوا فدیہ باطل ہو جائے گا اور فوت شدہ روزوں کی قضا رکھنی واجب ہوگی۔
(فتاوی عالمگیری:۱/۲۰۷)

(۵) بیماری کی وجہ سے بھی فدیہ دیا جا سکتا ہے، لیکن بیمار ایسا ہونا چاہئے کہ اس کی صحت کی طرف سے بالکل مایوسی ہو چکی ہو، یہاں تک کہ وہ ٹھنڈے اور چھوٹے دنوں میں بھی روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو، ایسے شخص کو اجازت ہے کہ وہ اپنے روزوں کا فدیہ دے دے، لیکن اگر بعد میں کسی وقت صحت واپس آگئی اور روزے رکھنے کی طاقت پیدا ہوگئی تو ان روزوں کی قضا رکھنی ضروری ہے جن کا فدیہ دیا جا چکا ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۳۲)

(۶) اگر کوئی بوڑھا شخص گرمی کے روزے نہیں رکھ سکتا لیکن سردی کے

ٹھنڈے اور چھوٹے روزے رکھ سکتا ہے تو اس کے لیے فدیہ دینا درست نہیں ہے۔
(خیر الفتاوی:۴/۵۷)

(۷) فدیہ کے مصارف وہی ہیں جو زکوۃ کے مصارف ہیں (فتاوی دار العلوم:۶/۴۵۹)

(۸) فدیہ بالکل صدقۂ فطر کی طرح ہے نصاب بھی وہی ہے اور ادائیگی کا طریقہ بھی وہی ہے، یعنی ایک فدیے کا گیہوں یا اس کی رقم دو یا زائد مسکینوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے اسی طرح متعدد روزوں کا فدیہ ایک ہی مسکین کو ادا کیا جا سکتا ہے۔ (فتاوی رحیمیہ:۵/۱۹۹) گذشتہ سالوں کے روزوں کا فدیہ اس وقت کے حساب سے دینا ہوگا جس وقت فدیہ ادا کیا جا رہا ہے، کیوں کہ فدیہ میں اصل گیہوں ہے، قیمت تو اس کے قائم مقام ہے، اس لیے اعتبار اس وقت کی قیمت کا ہوگا جس وقت فدیہ ادا کیا جا رہا ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۳۱)

<u>بچوں کا روزہ:</u>

بچوں کو شروع ہی سے روزہ رکھنے کی عادت ڈلوانی چاہیے، جو بچے بالغ ہونے کے بعد روزہ رکھنا شروع کرتے ہیں ان کو بڑی مشکل سے عادت پڑتی ہے روزے کی مثال نماز کی سی ہے، اگر بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے روزے کے لیے کہا جائے گا اور دس برس کا ہو جائے تو ڈانٹ ڈپٹ کر اور مار کر روزہ رکھوایا جائے گا۔ (فتاوی دار العلوم:۶/۴۹۰) اگر کوئی بچہ رمضان کے دن میں بالغ ہو جائے اور وہ روزے سے نہیں تھا تو اسے چاہیے کہ وہ دن کے باقی حصے میں کھانا پینا چھوڑ دے اور روزہ داروں کی طرح رہے، نابالغ بچہ اگر روزہ توڑ دیتا ہے تو اس کی قضا رکھوانا ضروری نہیں ہے۔ (احسن الفتاوی:۴/۴۳۰)

<u>تراویح کی فضیلت:</u>

روزے کے بعد رمضان المبارک کی دوسری اہم ترین عبادت تراویح ہے

احادیث میں نماز تراویح کے بڑے فضائل بیان کئے گئے ہیں، ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور میں نے رمضان کی رات میں قیام کو سنت قرار دیا ہے، جس شخص نے ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے اخلاص کے ساتھ رمضان کا روزہ رکھا اور رمضان کا قیام کیا وہ اپنے گناہوں سے اس طرح نکل جائے گا جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے دن تھا (نسائی:۴/۱۵۸، رقم الحدیث: ۲۲۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو قیام رمضان کی ترغیب دیا کرتے تھے، اس کا وجوبی و لازمی حکم نہیں فرماتے تھے، چنانچہ آپ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ایمان کی حالت میں اور ثواب کی امید کے ساتھ رمضان کا قیام کرے گا تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے (مسلم:۱/۵۲۳، رقم الحدیث: ۷۵۹) ایک روایت میں ہے کہ جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو فرشتے راستوں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! صبح سویرے اپنے رب کریم کی طرف چلو جو تم پر خیر و برکت کے عظیم احسانات فرمائیں گے اور تمہیں لامحدود اور لازوال ثواب عطا کریں گے، تمہیں رات کے قیام کا حکم دیا گیا تم نے قیام کیا اور تراویح پڑھی، تمہیں دن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تم نے روزہ رکھا اپنے رب کا حکم مانا اور اطاعت کی، لہٰذا تم اپنے انعامات حاصل کرو، جب بندے عید کی نماز سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ایک فرشتہ اعلان کرتا ہے کہ آگاہ رہو اللہ نے تمہاری مغفرت کر دی ہے، اب تم اپنے گھروں کی طرف ہدایت یافتہ ہو کر جاؤ، آج انعام کا دن ہے اور اس دن کا نام آسمان میں یوم الجائزہ (انعام کا دن) رکھا جاتا ہے (مجمع الزوائد:۳/رقم الحدیث:۳۲۲۵، المعجم الکبیر:۱/۲۲۶، رقم الحدیث:۶۱۷) تراویح کی فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شہر کے لوگ تراویح

ترک کردیں تو امام المسلمین اس شہر کے لوگوں سے جنگ کرے گا، فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ تراویح کی سنت کا منکر بدعتی اور گمراہ ہے، ایسے شخص کی شہادت بھی معتبر نہیں ہے۔ (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۲۲۴)

تراویح میں قرآن کریم کی تلاوت:

قرآن کریم اور رمضان میں باہم ربط ہے، اگر اس ربط کو قران السعدین کہا جائے تو غلط نہ ہوگا، رمضان المبارک میں قرآن کریم کا نزول ہوا ہے، اس مہینے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ تلاوت فرمایا کرتے تھے، اس مہینے میں حضرت جبرئیل امینؑ تشریف لاتے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن کریم کا دور کرتے، بعض روایات میں روزے اور قرآن کا ایک ساتھ ذکر ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ماہ میں زیادہ سے زیادہ تلاوت قرآن مطلوب ہے، قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا سب سے بڑا ذریعہ تراویح کی نماز ہی ہے، دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تراویح کے اندر قرآن پڑھنے اور سننے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جیسا کہ ایک مرسل روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک کی رات میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو دیکھا کہ مسجد کے ایک گوشے میں کچھ لوگ جماعت سے نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں، کسی نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے حافظ نہیں ہیں یہ لوگ حضرت ابی ابن کعبؓ کے پیچھے نماز میں قرآن کریم سن رہے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا بہت اچھا کر رہے ہیں۔ (سنن البیہقی الکبری: ۴۹۵/۲، رقم الحدیث: ۴۳۸۶)

شروع میں لوگ مسجدوں میں چھوٹی چھوٹی جماعتیں بنا کر تراویح کی نماز پڑھتے تھے اور قرآن کریم پڑھتے اور سنتے تھے، حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے

دور خلافت میں تراویح کی باجماعت نماز مقرر کر دی، سب سے پہلے حضرت ابی ابن کعبؓ نے باجماعت تراویح پڑھائی (بخاری: ۲۶۱/۱) بہر حال تراویح میں قرآن کریم پڑھنا اور سننا دونوں بڑی فضیلت کے کام ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روزہ اور قرآن دونوں قیامت کے دن بندے کی سفارش کریں گے، روزہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار میں نے اسے کھانے اور شہوت سے روکا تھا آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرمالے، قرآن کہے گا کہ اے میرے پروردگار میں نے اسے رات کو سونے سے روکا تھا آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرمالے (مسند احمد بن حنبلؒ: ۱۷۴/۲، رقم الحدیث: ۶۶۲۶)

تلاوت قرآن کے بڑے فضائل ہیں ایک مشہور روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس شخص نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا اس کے لیے اللہ تعالیٰ ایک نیکی لکھتے ہیں اور ایک نیکی کا ثواب دس گنا ملتا ہے، میں نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے، میم ایک حرف ہے (ترمذی: ۱۷۵/۵، رقم الحدیث: ۲۹۱۰) مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے، جس طرح اس کے معانی کا سمجھنا اور اس کے بتلائے ہوئے احکام پر عمل کرنا فرض اور اعلا عبادت ہے اسی طرح اس کے الفاظ کی تلاوت بھی ایک مستقل عبادت ہے اور عظیم ثواب کا کام ہے (معارف القرآن: ۳۳۲/۱) اور اگر قرآن نماز کے اندر پڑھا جائے تو اس کا اجر اور بھی بڑھ جاتا ہے، حدیث شریف میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "نماز میں قرآن کریم کی تلاوت بہ غیر نماز کی تلاوت سے افضل ہے اور بہ غیر نماز کی تلاوت تسبیح وتکبیر سے افضل ہے (شعب الایمان للبیہقی: ۴۱۳/۲، رقم الحدیث: ۲۲۴۳، کنز العمال: ۵۱۶/۱، رقم الحدیث: ۲۳۰۴) دو باتیں اور بھی ذہن میں رہنی چاہئیں ایک تو مسجد میں نماز کا ثواب گھر

کے مقابلے میں پچیس گنا زیادہ ہوتا ہے (سنن ابن ماجہ: ۱/۴۵۳، رقم الحدیث: ۱۴۱۳) دوسری بات یہ ہے کہ تنہا نماز کے مقابلے میں باجماعت نماز پڑھنے کا ثواب ستائیس گنا زیادہ ہے (بخاری: ۱/۲۳۱، رقم الحدیث: ۶۱۹، مسلم: ۱/۴۵۰، رقم الحدیث: ۶۵۰، ابن ماجہ: ۱/۲۵۹، رقم الحدیث: ۷۸۹) اس لحاظ سے تراویح میں مسجد کے اندر باجماعت قرآن کریم پڑھا یا سنا جائے گا تو اس کا ثواب بھی اسی حساب سے بڑھتا رہے گا جیسا کہ نمازوں کا بڑھتا ہے، رمضان المبارک میں ہر نیکی کا ثواب ستر گنا ہے یہ بالکل الگ ہی معاملہ ہے دیکھا جائے تو رمضان المبارک میں مسجد کے اندر باجماعت تراویح میں قرآن کریم پڑھنے اور سننے کا ثواب اتنا بڑھ جائے گا کہ اس کو حساب اور شمار میں لانا بھی مشکل ہے (فضائل حفظ القرآن، ص: ۹۰)

تراویح میں ختم قرآن:

تراویح میں کم از کم ایک مرتبہ قرآن کریم مکمل کرنا سنت ہے (فتاوی شامی: ۲/۴۳۳) جہاں تک تراویح میں ختم قرآن کی فضیلت کا سوال ہے اس سلسلے میں صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ تراویح کے اندر قرآن کریم مکمل کرنا غیر تراویح میں مکمل کرنے کے مقابلے میں بدرجہا افضل ہے، علماء نے اس کی متعدد وجوہ لکھی ہیں (۱) ایک تو یہ کہ ختم قرآن کا عمل رمضان کے بابرکت مہینے میں ہوتا ہے اور رمضان میں ادا کئے گئے عمل کو دوسرے دنوں کے عمل پر عظیم الشان فضیلت حاصل ہے (۲) دوسرے یہ کہ یہ باوضو پڑھ کر یا سن کر مکمل کیا جاتا ہے جس کی فضیلت بے وضو پڑھنے یا سننے سے زیادہ ہے (۳) تیسرے یہ کہ نماز کی شکل میں مکمل کیا جاتا ہے اور نماز میں پڑھے ہوئے قرآن کریم کی فضیلت غیر نماز سے افضل ہے (۴) چوتھے یہ کہ کھڑے ہو کر پڑھا یا سنا جاتا ہے جس کی فضیلت بیٹھ کر پڑھنے یا سننے سے زیادہ ہے (۵) پانچویں یہ کہ باجماعت نماز کی شکل میں اس کی تکمیل ہوتی ہے جس کی فضیلت تنہا نماز سے

زیادہ ہے (۶) چھٹے عموماً مساجد میں مکمل کیا جاتا ہے اور مسجد کا عمل یقیناً اہمیت اور یقیناً فضیلت کا حامل ہے (۷) ساتویں یہ کہ تراویح میں پڑھے ہوئے قرآن کریم میں غلطی بتلانے والے سامع کا بھی انتظام ہوتا ہے، اس طرح غلط پڑھے جانے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں، جب کہ انسان خود بیٹھ کر پڑھے تو غلطی کا احتمال زیادہ رہتا ہے (ماہ رمضان کے فضائل واحکام، ص: ۱۶۲)

ایک طرف اتنی فضیلتیں ہیں اور دوسری طرف ہماری بے حسی کا یہ عالم کہ اس ایک ماہ میں بھی ہم ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے خود کو قرآن پڑھنے اور سننے کے لیے وقف نہیں کر سکتے اور اگر پڑھتے بھی ہیں یا سنتے بھی ہیں تو اسے بوجھ سمجھتے ہیں اور اس بوجھ کو جلد از جلد اپنے سر سے اتار دینے کی کوشش کرتے ہیں، قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اسے دل لگا کر پڑھئے اور دل لگا کر سنئے۔

تراویح کے ضروری مسائل:

(۱) رمضان المبارک میں عشاء کی فرض نماز کے بعد دس سلاموں سے بیس رکعت مردوں کے لیے جماعت کے ساتھ اور عورتوں کے لیے الگ الگ اپنے گھروں میں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، بلا عذر تراویح چھوڑنے والا مرد ہو یا عورت گنہ گار ہے تراویح کی بیس رکعتیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہیں دور اول سے آج تک بیس رکعتیں ہوتی ہیں، لہذا آٹھ رکعت پر اکتفا کرنا صحیح نہیں ہے (فتاوی شامی: ۲/۴۲۹)

(۲) پورے رمضان میں ایک بار قرآن کریم کا ترتیب وار پڑھنا یا سننا مردوں کے لیے سنت مؤکدہ ہے، لوگوں کی سستی یا کاہلی کی وجہ سے اس سنت کو ترک نہ کرنا چاہئے، ہاں اگر یہ اندیشہ ہو کہ پورا قرآن شریف پڑھا گیا تو لوگ مسجد میں نہیں آئیں گے تب چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھی جا سکتی ہیں (امداد الفتاوی: ۱/۳۰۰

فتاوی رحیمیہ: ۴/ ۴۰۵، کفایۃ المفتی: ۳/ ۳۶۱)

(۳) تراویح کی نماز پورے رمضان کی سنت ہے، اگر کسی جگہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے قرآن کریم مکمل ہو جائے تو باقی دنوں میں بھی نماز تراویح حسب دستور ادا کی جاتی رہے گی، کیوں کہ اس طرح صرف قرآن کریم مکمل ہونے کی سنت ادا ہوتی ہے تراویح کی سنت باقی رہتی ہے اور جب تک رمضان باقی ہے اس سنت پر عمل کرنا ضروری ہے (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۱۶)

(۴) اگر محلے کی مسجد میں تراویح ہو رہی ہو تو گھروں میں تراویح کی نماز باجماعت کا اہتمام کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ مسجد میں تراویح کی باجماعت ادائگی سنت علی الکفایہ ہے اگر اس پر عمل نہ کیا گیا تو پورا محلہ گنہ گار ہوگا۔ (فتاوی شامی: ۲/ ۴۳۱، فتاوی دار العلوم: ۴/ ۲۵۱)

(۵) ایک مسجد میں دو حافظ الگ الگ نماز تراویح پڑھا سکتے ہیں، بہ شرط یہ کہ ایک دوسرے کی آواز نہ ٹکرائے، بہتر یہی ہے کہ تمام لوگ ایک ہی امام کے پیچھے نماز تراویح ادا کریں (امداد الفتاوی: ۱/ ۴۶۹)

(۶) صرف عورتوں کی نماز باجماعت خواہ تراویح کی ہو مکروہ ہے، لیکن اگر وہ کراہت کے باوجود جماعت کر رہی ہیں تو انہیں چاہئے کہ جو عورت امامت کرے وہ عورتوں کی صف میں مقتدیوں کے ساتھ کھڑی ہو، آگے بڑھ کر کھڑی نہ ہو (خواتین کے شرعی احکام، ص: ۲۷۳) البتہ اگر امام مرد ہو تو اس کے پیچھے عورتیں تراویح پڑھ سکتی ہیں بہ شرط یہ کہ نماز میں کچھ مرد بھی ہوں اور عورتیں پردے کے پیچھے صف بنا کر کھڑی ہوئی ہوں، اگر امام مرد ہو اور باقی تمام اجنبی عورتیں ہوں تو نماز مکروہ ہوگی: لیکن اگر مقتدی عورتوں میں امام کی محرم خاتون (مثلاً بیوی) بھی شامل ہو تو نماز بلا کراہت درست ہوگی۔ (فتاوی شامی: ۲/ ۳۰۷)

(۷) بلا عذر تراویح بیٹھ کر ادا کرنا درست ہے مگر غیر مستحب ہے، تاہم اس طرح ثواب نصف ہو جائے گا، اگر عذر کی وجہ سے بیٹھ کر ادا کرے تو ثواب میں ان شاء اللہ کمی نہ ہوگی، تراویح میں قیام فرض نہیں ہے، اس لیے اگر کسی نے نماز تراویح کھڑے ہو کر شروع کی، دوسری رکعت میں بیٹھ کر پڑھنے لگا یا پہلی رکعت بیٹھ کر شروع کی اور دوسری رکعت میں کھڑا ہو گیا تمام صورتیں درست ہیں (احسن الفتاوی: ۳/ ۵۲۶)

(۸) تراویح کا وقت عشاء کی نماز کے بعد شروع ہوتا ہے اور صبح صادق تک رہتا ہے، جلدی کے چکر میں وقت سے پہلے تراویح پڑھنا درست نہیں، اگر کسی نے پڑھ لی تو وہ معتبر نہیں ہوگی، عشاء کی فرض نماز کے بعد دوبارہ پڑھنی ہوگی (درمختار: ۲/ ۴۳۰) اگر کسی نے تراویح نہیں پڑھی اور صبح صادق ہوگئی تو اب اس کی قضا نہیں ہے، ایسے شخص کو توبہ و استغفار کرنا چاہئے (درمختار: ۲/ ۴۳۱)

(۹) رمضان میں وتر کی نماز تراویح کے بعد باجماعت پڑھنا افضل ہے (درمختار: ۲/ ۴۳۷) اگر کسی شخص کی عشاء باجماعت رہ گئی ہو اور تراویح شروع ہو چکی ہو تو اسے چاہئے کے پہلے عشاء کی نماز (چار فرض دو سنت) پڑھے، پھر تراویح میں شریک ہو جائے، تراویح کی جو رکعتیں رہ گئی ہیں ان کو وتروں کے بعد بھی ادا کیا جا سکتا ہے بعض لوگ جلدی کی وجہ سے تراویح کے دوران ہی فوت شدہ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں ایسا نہ کرنا چاہئے، اطمینان کے ساتھ تراویح پڑھے بعد میں جو رکعتیں رہ گئی ہوں ان کو پڑھ کر بیس کی تعداد پوری کرلے (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۱۷)

(۱۰) تراویح کی نماز میں ہر چار رکعت پر بیٹھنا پسندیدہ ہے اسے ترویحہ کہتے ہیں اس دوران خاموش بھی بیٹھا جا سکتا ہے اور تسبیحات بھی پڑھی جا سکتی ہے، بہتر یہ ہے کہ یہ دُعا پڑھے: سُبْحَانَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّةِ وَالْعَظْمَةِ وَالْهَيْبَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ. سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْحَيِّ

الَّذِیْ لَایَنَامُ وَلَایَمُوْتُ سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلَائِکَۃِ وَالرُّوْحِ. اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ یَامُجِیْرُ یَامُجِیْرُ یَامُجِیْرُ. (فتاوی شامی: ۲/ ۴۴۳)

(۱۱) تراویح کی نماز کے لیے باشرع حافظ ہونا چاہیے، جس حافظ کی داڑھی شریعت کے مطابق نہ ہو، کھلے طور پر نماز چھوڑتا ہو، باجماعت نماز کا اہتمام نہ کرتا ہو ایسے حافظ کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ الم تر کیف سے پڑھ لی جائے، ہاں اگر اس شخص کے علاوہ کوئی دوسرا امام الم تر کیف سے بھی پڑھانے والا نہ ہو تب اس کے پیچھے نماز پڑھ لینی چاہئے کیوں کہ ترکِ جماعت سے بہر حال جماعت افضل ہے (فتاوی شامی: ۲/ ۳۰۱)

(۱۲) نابالغ بچے کے پیچھے تراویح کی نماز درست نہیں ہے، جب تک بچہ پندرہ سال کا نہ ہو جائے یا اس عمر تک پہنچنے سے پہلے اس میں بلوغ کی علامت مثلاً انزال واحتلام نہ پائی جائے اس وقت تک اسے امام بنانا صحیح نہیں ہے، بعض جگہوں پر بچوں کو حافظ ہوتے ہی مصلّے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے اور ان کے بلوغ یا عمر کی تحقیق نہیں کی جاتی، یہ بے احتیاطی کی باتیں ہیں، نابالغ کے پیچھے تو نفل نماز بھی نہیں ہوتی تراویح تو پھر سنت مؤکدہ ہے (فتاوی شامی: ۲/ ۳۲۲)

(۱۳) ایسے حافظ کو امام بنانا درست نہیں ہے جس کا تلفظ صحیح نہ ہو، وہ قرآن کریم غلط پڑھتا ہو، یا اس قدر تیز پڑھتا ہو کہ یعلمون تعلمون کے سوا کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو، یا نماز کے ارکان اتنی جلدی ادا کرتا ہو کہ فرائض وواجبات بھی پورے نہ ہوتے ہوں، ایسے شخص کو بھی امام بنانا جائز نہیں جس کو نماز کے ضروری مسائل بھی معلوم نہ ہوں، اسے یہ بھی پتہ نہ ہو کہ کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور کن چیزوں سے سجدۂ سہو لازم آتا ہے (احسن الفتاوی: ۳/ ۳۰۲)

(۱۴) تراویح میں لاؤڈ اسپیکر استعمال کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ اس کا مقصد مسجد

کے حاضرین تک آواز پہنچانا ہو، لاؤڈ اسپیکر اس طرح لگانا کہ مسجد کے باہر تک آواز جائے درست نہیں ہے، اس سے قرآن کریم کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

(۱۵) قرآن کریم پڑھنا عبادت ہے، اس پر کسی طرح سے بھی نذرانہ، عطیہ معاوضہ، یا اجرت طے کر کے یا طے کئے بغیر لینا جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے: اقرؤو القرآن ولاتاکلوا به "قرآن پڑھو اس کو کھانے کا ذریعہ نہ بناؤ" (مسند احمد بن حنبل: ۳/ ۴۲۸، رقم الحدیث: ۱۵۵۷۴) اصحاب افتاء کا متفقہ فتوی ہے کہ تراویح پڑھا کر اجرت لینا کسی بھی طرح درست نہیں ہے، لینے اور دینے والے دونوں گناہ گار ہوں گے (امداد الفتاوی: ۱/ ۴۸۱، فتاوی دار العلوم: ۴/ ۲۴۶، احسن الفتاوی: ۳/ ۵۱۴)

(۱۶) ایک دن یا تین دن میں قرآن کریم تراویح کے اندر ختم کرنا درست ہے بہ شرطیکہ قرآن پاک صاف اور صحت کے ساتھ پڑھا جائے اور شہرت مقصود نہ ہو، مقتدی ست نہ ہوں، اگر کچھ لوگ بیٹھے رہیں اور باتیں کرتے رہیں یا کھانے پینے کے انتظام میں لگے رہیں اور ان کی تراویح فوت ہو جائے تو یہ جائز نہیں ہے (فتاوی دار العلوم: ۴/ ۲۵۶)

(۱۷) نوافل میں چاہے وہ تہجد ہی کیوں نہ ہو جماعت کا اہتمام کرنا درست نہیں ہے، تہجد کی نماز رمضان اور غیر رمضان میں باجماعت پڑھنے کا اہتمام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرامؓ سے منقول نہیں ہے، اس لیے فقہاء لکھتے ہیں کہ تہجد وغیرہ نفل نماز باجماعت پڑھنا درست نہیں ہے، البتہ بہ غیر بلائے ایک یا دو مقتدیوں کے ساتھ درست ہے، تین مقتدیوں کے ساتھ جواز میں اختلاف ہے اور چار مقتدیوں کے ساتھ بالاجماع ناجائز ہے (فتاوی رحیمیہ، ۵/ ۲۱۷، فتاوی دار العلوم: ۴/ ۲۲۱، امداد الفتاوی: ۱/ ۳۷۷)

(۱۸) تراویح میں قرآن کریم ستائیسویں شب میں ختم کرنا افضل ومستحب ہے، لیکن اس تاریخ کو لازمی قرار دینا درست نہیں ہے، اگر کسی علاقے میں یہ تاریخ

متعین کرلی گئی ہوتو اہل علم کو اس کے خلاف کرکے دوسری تاریخوں میں ختم کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کے ذہنوں سے اس تاریخ کا التزام نکل جائے، بہتر یہ ہے کہ روزانہ اتنی مقدار میں قرآن شریف پڑھا جائے کہ ستائیسویں یا انیسویں تاریخ میں ختم ہوجائے۔ (فتاوی شامی: ۲/۴۳۳)

اعتکاف کی فضیلت:

رمضان کے آخری دس دنوں کے لیے بہ نیت عبادت وثواب خود کو مسجد میں محصور کرلینا مسنون اعتکاف ہے، اعتکاف کے معنی ہیں ٹھہرنا اور رکنا، اعتکاف کرنے والا بھی اپنے آپ کو ایک جگہ روک لیتا ہے، اسی لیے اس کو اعتکاف کہتے ہیں۔ (عمدۃ القاری: ۸/۳۶۰)

اعتکاف اس لیے مشروع قرار دیا گیا ہے تاکہ بندہ ساری دنیا سے اپنے علائق منقطع کرکے یکسو ہوکر مسجد میں بیٹھ جائے اور اپنی پوری توجہ عبادتوں میں لگادے سارے سال دل ودماغ دنیا کے معاملات میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ چند لمحے بھی یکسوئی کے ساتھ عبادت کرنا نصیب نہیں ہوتا، اعتکاف کے چند روز ان لوگوں کے لیے کسی عظیم نعمت سے کم نہیں ہیں جو کاروبار حیات سے الگ ہوکر کچھ وقت اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں گزارنا چاہتے ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم معمولاً اعتکاف فرمایا کرتے تھے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، روایات میں ہے کہ آپ نے ہمیشہ اعتکاف کی پابندی فرمائی اور کبھی اعتکاف کرنا نہیں چھوڑا، ایک سال سفر وغیرہ کی وجہ سے اعتکاف نہ کرسکے تو اگلے سال بیس دن کا اعتکاف فرمایا (ابوداؤد: ۱/۴۷۷، رقم الحدیث: ۲۴۶۳، ترمذی: ۳/۱۶۶، رقم الحدیث: ۸۰۳)

حضرت عائشہ الصدیقہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وفات دے دی

پھر آپ کے بعد آپ کی ازواج مطہرات اعتکاف کرتی رہیں (بخاری: ۲/۱۳/۷ رقم الحدیث: ۱۹۲۲، مسلم: ۲/۸۳۰، رقم الحدیث: ۱۱۷۲)

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ کی رضاجوئی کے لیے ایک دن کا اعتکاف کیا اللہ تعالیٰ اس کے اور دوزخ کے درمیان تین خندقوں کی آڑ بنادیں گے اور ایک خندق سے دوسری خندق کے درمیان کی مسافت مشرق ومغرب کی مسافت سے زیادہ ہوگی (المعجم الاوسط: ۷/۲۲۰ رقم الحدیث: ۷۳۲۶، بیہقی فی شعب الایمان: ۳/ص۴۲۴، رقم الحدیث: ۳۹۶۵ کنز العمال: ۸/۵۳۲) اعتکاف کرنے والے شخص کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ "اعتکاف کرنے والا گناہوں سے بچا رہتا ہے اور اس کے لیے بغیر کیے بھی اتنی ہی نیکیاں لکھی جاتی ہیں جتنی نیکیاں کرنے والے کے لیے لکھی جاتی ہیں (ابن ماجہ: ۱/۵۶۷، رقم الحدیث: ۱۷۸۱) ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے رمضان کے دس روز کا اعتکاف کیا اس کا یہ عمل دو حج اور دو عمروں کے برابر ہوگا (البیہقی فی شعب الایمان: ۳/۴۲۵، رقم الحدیث: ۳۹۶۶، کنز العمال: ۸/۳۵۰) ایک روایت میں ہے کہ جس نے ایمان اور اخلاص کے ساتھ اعتکاف کیا تو اس کے (تمام صغیرہ) گناہ معاف کردیئے جائیں گے (کنز العمال: ۸/۵۳۲، رقم الحدیث: ۲۴۰۱۷) یہ اللہ کا بڑا احسان وانعام ہے کہ اس نے رمضان المبارک جیسا مہینہ عطا فرمایا اور پھر اس ماہ میں دس روز کا اعتکاف مسنون قرار دیا اور اس کا اتنا بڑا اجر وثواب رکھا کہ کم محنت اور کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمائی جاسکتی ہیں، اسی لیے صحابۂ کرامؓ اور سلف صالحین اور ہمارے اکابر حضرات اعتکاف کی سنت پر پابندی کے ساتھ عمل کیا کرتے تھے۔

اعتکاف کا مقصد کیا ہے؟

اعتکاف اگر شہرت اور نام وری کے لیے کرے تو اس سے بہتر نہ کرنا ہے کیوں

کہ عبادات میں ریاکاری مطلوب نہیں ہے، بلکہ اخلاص مطلوب ہے، اخلاص کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی جو کام بھی کرے اللہ کے لیے کرے اور اس کی نیت اجر وثواب کا حصول ہو، اس کے علاوہ کچھ نہ ہو، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے لکھا ہے کہ "اعتکاف کا مقصد اور اس کی روح دل کو اللہ کی پاک ذات کے ساتھ وابستہ کر لینا ہے کہ سب کی طرف سے ہٹ کر اسی کے ساتھ مجتمع ہو جائے، اور ساری مشغولیت کے بدلے میں اسی کی پاک ذات سے مشغول ہو جائے، اور اس کے غیر کی طرف سے منقطع ہو کر اس میں اس طرح لگ جائے کہ خیالات وتفکرات سب کی جگہ اس کا پاک ذکر اور اس کی محبت سما جائے یہاں تک کہ مخلوق کے ساتھ انس ومحبت کے بدلے اللہ کے ساتھ محبت پیدا ہو جائے کہ یہ اُنس قبر کی وحشت میں کام دے اس دن اللہ کی پاک ذات کے سوا نہ کوئی مونس ہوگا نہ دل بہلانے والا اگر دل اس کے ساتھ مانوس ہو چکا ہوگا تو کس قدر لذت سے وقت گزرے گا (فضائل رمضان ۵۱)

اعتکاف کے فوائد وثمرات:

اعتکاف کے بے شمار فوائد ہیں جن میں سے کچھ یہاں بیان کئے جاتے ہیں (۱) اعتکاف اللہ کو راضی کرنے اور اس سے محبت پیدا کرنے کا بہترین وسیلہ ہے (۲) اعتکاف کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بہترین قرب حاصل ہوتا ہے اور خلوت میں اللہ سے مناجات کا صحیح موقع ملتا ہے (۳) اعتکاف کی حالت میں ہر وقت فرشتوں کے ساتھ مشابہت رہتی ہے (۴) اعتکاف گناہ معاف ہونے کا بہترین ذریعہ ہے (۵) اعتکاف کرنے والا بہت سے گناہوں سے محفوظ ہو جاتا ہے (۶) اعتکاف کی حالت میں بندہ ہر وقت اللہ کے دربار میں حاضر رہتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی نظر کرم اور نظر رحمت کا زیادہ سے زیادہ مستحق ہوتا ہے (۷) اعتکاف کرنے والے کی مثال

ایسی ہے جیسے کوئی اللہ کے در پر آپڑا ہو اور یہ کہہ رہا ہو کہ جب تک آپ میری مغفرت نہیں فرمائیں گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا (۸) اعتکاف شب قدر سے فائدہ اٹھانے کا بہترین ذریعہ ہے اور اسی لیے مسنون اعتکاف جو کہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں کیا جاتا ہے اعتکاف کی دوسری قسموں سے افضل ہے کیوں کہ یہ فضیلت اعتکاف کی دوسری قسموں میں حاصل ہونا مشکل ہے (ماہ رمضان کے فضائل واحکام، ص: ۲۷۶)

اعتکاف کرنا کب درست ہے؟

جس مسجد میں اعتکاف کیا جائے اس میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت ہوتی ہو، اعتکاف کی نیت سے ٹھہرنا ضروری ہے، بے مقصد اور بے ارادہ ٹھہرنے کو اعتکاف نہیں کہتے، نیت کی صحت کے لیے اسلام اور عقل شرط ہے، اس لیے اعتکاف کے لیے مسلمان ہونا تو ضروری ہے ہی عاقل ہونا بھی ضروری ہے، بالغ ہونا شرط نہیں ہے نابالغ مگر سمجھدار بچہ بھی اعتکاف کر سکتا ہے (علم الفقہ، ۴۴۸)

اعتکاف کی نوعیت:

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں جو اعتکاف کیا جاتا ہے وہ سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر آبادی (بستی) کی مسجد میں اعتکاف کرنا ضروری ہے، اگر کسی نے بھی اعتکاف نہیں کیا تو اس آبادی کے تمام مسلمان گنہگار ہوں گے، لیکن اگر ایک نے بھی اعتکاف کر لیا تو تمام لوگوں کے ذمے سے اس کا وجوب ساقط ہو جائے گا اور تمام بستی والوں کی طرف سے ادائیگی ہو جائے گی، تاہم بہتر یہ ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں اعتکاف کا اہتمام کیا جائے کیوں کہ بعض علماء نے ہر محلے والوں کے لیے اعتکاف کو سنت قرار دیا ہے، (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۳۸۲ احسن الفتاوی: ۴/۴۹۸، فتاوی دار العلوم: ۶/۵۱۲) لیکن بڑے قصبے کی مسجد میں

اعتکاف کرنے سے اس سے متصل چھوٹی بستی کے لوگوں کے ذمہ سے یہ سنت کفایہ ادا نہیں ہوگی۔ (فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۵۰۱)

مسنون اعتکاف کا وقت:

رمضان المبارک کی بیس تاریخ کو سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے مسنون اعتکاف کا وقت شروع ہوتا ہے اور عید کا چاند نظر آنے تک رہتا ہے، اگر کسی نے اکیس تاریخ سے اعتکاف شروع کیا تو یہ اعتکاف مسنون نہیں ہوگا اور نہ اس پر مسنون اعتکاف کا اجر ملے گا۔ (امداد الفتاوی: ۲/ ۱۵۴، فتاوی دار العلوم: ۶/ ۵۰۸)

سب سے افضل اعتکاف:

سب سے افضل وہ اعتکاف ہے جو مسجد حرام یعنی کعبۃ اللہ کی مسجد میں کیا جائے، اس کے بعد مسجد نبوی کا، اس کے بعد مسجد بیت المقدس کا، اس کے بعد اس جامع مسجد کا جس میں جماعت کا انتظام ہو، اگر جامع مسجد میں جماعت کا انتظام نہ ہو تو محلے کی مسجد کا اس کے بعد اس مسجد کا جس میں زیادہ جماعت ہوتی ہو (علم الفقہ: ۴۴۸)

اعتکاف کے لیے روزہ ضروری ہے:

مسنون اعتکاف کے لیے روزہ شرط ہے، جب کوئی شخص اعتکاف کرے گا تو اس کو روزہ رکھنا بھی ضروری ہوگا بلکہ اگر وہ روزہ نہ رکھنے کی نیت بھی کرے تب بھی اس کو روزہ رکھنا لازم ہوگا، اسی لیے اگر کوئی شخص صرف رات کے اعتکاف کی نیت کرے وہ لغو ہے، کیوں کہ رات کو روزہ نہیں رکھا جاتا، ہاں اگر رات اور دن دونوں کی نیت کرے یا کئی دنوں کی نیت کرے تو رات ضمناً داخل ہو جائے گی اور رات کو اعتکاف کرنا ضروری ہوگا۔ (علم الفقہ: ۴۴۹)

اعتکاف کے مستحب اعمال:

اعتکاف کے دوران نوافل کی کثرت ہونی چاہیے، قرآن کریم کی تلاوت کا

معمول رکھا جائے اور تسبیحات وغیرہ پڑھی جائیں، خاص طور پر یہ تسبیحات پڑھیں سُبْحَانَ اللّٰہِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ لَا حَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ یَارَبِّ اغْفِرْلِیْ۔ درود شریف بھی بہ کثرت پڑھنا چاہیے، سب سے بہتر درود وہ ہے جو نماز میں تشہد کے بعد پڑھا جاتا ہے، صلوۃ التسبیح کا اہتمام کریں، ہو سکے تو روز پڑھیں، اس سے بہت سے گناہ معاف ہوتے ہیں، اعتکاف کے دوران اشراق چاشت، اوّابین اور تشہد وغیرہ نمازیں آسانی کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہیں، ان کا اہتمام کیا جائے، تحیۃ الوضو بھی پڑھنی چاہیے، فجر کی نماز کے بعد اشراق کے وقت اور شام کو عصر کی نماز سے فارغ ہو کر مغرب تک ذکر و تلاوت میں مشغول رہیں، شب قدر کی راتوں میں جاگ کر عبادت بھی کی جائے، ہو سکے تو مستند دینی کتابوں کا مطالعہ بھی رکھیں، دعاؤں میں الحزب الاعظم اور مناجات مقبول پیش نظر رہیں، بلکہ ان دونوں کتابوں کی ایک ایک منزل روزانہ پڑھ لیں، اعتکاف کے دوران اپنے کسی قول یا فعل سے کسی دوسرے معتکف کو یا دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ پہنچانی چاہیے۔

اعتکاف میں کونسے کام جائز ہیں:

(۱) مسجد میں کھانا پینا اور سونا، شرط یہ ہے کہ کھانے پینے سے مسجد گندی نہ ہو بہتر یہ ہے کہ دسترخوان وغیرہ بچھا کر کھایا جائے، سونے کے لیے بھی مسجد کی دری یا چٹائی استعمال نہ کی جائے بلکہ اپنا بستر بچھایا جائے، (۲) اعتکاف کی حالت میں بات چیت ممنوع نہیں ہے لیکن فضول گوئی سے اجتناب کرنا چاہیے (۳) خوشبو لگانا، کپڑے بدلنا، سر اور ڈاڑھی میں تیل لگانا کنگھا کرنا یہ سب جائز ہیں، ان میں بھی شرط یہی ہے کہ تیل سے مسجد کا فرش یا دری گندی نہ ہو بال وغیرہ نہ گریں (۴) خورد و نوش کا سامان اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں مثلاً کپڑے وغیرہ بھی اپنے پاس رکھے جاسکتے

ہیں، لیکن یہ چیزیں اتنی نہ ہوں کہ انبار لگ جائے اور نمازیوں کو پریشانی ہو (۵) اپنا یا کسی
دوسرے کا نکاح کرنا، اگر بیوی کو طلاق رجعی دے رکھی ہو تو اس سے زبانی رجوع کر لینا
(۶) اپنے قائم مقام یا ماتحت ملازمین کو ضروری ہدایات دینا (۷) اگر حکیم یا ڈاکٹر ہو تو
مریض دیکھ لینا، نسخہ لکھ دینا، یا دوا بتلا دینا (یہ نہیں کہ باقاعدہ دوکان کھول کر بیٹھ
جائے) (۸) قرآن وحدیث اور دیگر دینی علوم کی درس وتدریس کی بھی گنجائش ہے
(۹) حالت اعتکاف میں بے وضو ہو جانا (۱۰) برتن یا کپڑے دھو لینا بہ شرط یہ کہ گندہ پانی
مسجد سے باہر گرے اور معتکف مسجد کے اندر رہے، (۱۱) ریح خارج ہونا (۱۲) ناخن
کاٹنا، سر کے بال یا مونچھیں کاٹنا یا کٹوانا، خط بنوانا وغیرہ لیکن بال وغیرہ مسجد میں نہ
گریں اور حجام مسجد سے باہر بیٹھے (۱۳) کوئی ضرورت کی چیز خریدنی ہو تو اسے دیکھنے
کے لیے مسجد کے اندر منگوا لینا (۱۴) ضرورت کے تحت اپنے اہل خانہ کے لیے
خرید وفروخت سے متعلق بات چیت کرنا (۱۵) مسجد میں اپنے معتکف (اعتکاف کی جگہ)
کو چادر سے گھیر دینا، مگر زیادہ جگہ نہ گھیرنی چاہئے، پردے سے یک سوئی بھی رہتی ہے
اور سونے کی حالت میں ستر کھلنے کا اندیشہ بھی نہیں رہتا (۱۶) ضروری کام کے لیے
بیوی بیٹی، بہن، والدہ وغیرہ محرم خواتین مسجد کے اندر معتکف کے پاس آ کر بیٹھ سکتی ہیں
اور گفتگو کر سکتی ہیں، مگر ان اوقات میں آئیں جب مسجد کے اندر نمازی نہ ہوں، پردے
کا اہتمام بھی ضروری ہے نیز مسجد میں زور زور سے بولنا بھی مناسب نہیں ہے
(۱۷) اگر کوئی شخص پان کھانے کا عادی ہے تو مسجد کے اندر کھا سکتا ہے بشرطیکہ اس
سے بدبو نہ آئے اور نمازیوں کو پریشانی نہ ہو، اسی لیے سگریٹ وغیرہ کو منع کیا جاتا ہے
کیوں کہ اس کی بو تکلیف دہ ہے، پان کی پیک سے مسجد کو گندہ نہ کرے باہر تھوکے یا
اگالدان استعمال کرے اور مسجد کے باہر رکھوا دے (فتاوی شامی: ۳/ ۴۳۸، فتاوی
عالمگیری: ۱/ ۲۱۳، البحر الرائق: ۲/ ۵۲۲)

اعتکاف کے دوران مکروہ اور ممنوع کام:

(۱) معتکف کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی شخص کو محض باتیں کرنے کے لیے مسجد
میں بلائے اور محفل جما کر بیٹھے (۲) بعض لوگ اپنے دوستوں کے ساتھ اس لیے
اعتکاف کرتے ہیں کہ دل لگا رہے گا اور وقت اچھا گزرے گا، چناں چہ اعتکاف کے
دوران خوب ہنسی مذاق ہوتا ہے، یہ اعتکاف کے آداب کے خلاف ہے (۳) مسجد میں
چہل قدمی کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر صحت کے لیے ضروری ہو، یا کھانے کے بعد کچھ دیر
ٹہلنے کی عادت ہو تو مسجد کے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اندرون مسجد ایک طرف تھوڑی
بہت چہل قدمی کی جا سکتی ہے (۶) مسجد میں بلند آواز سے بات کرنا سخت بے ادبی
ہے، بعض لوگ اعتکاف کی حالت میں زور زور سے بولتے ہیں اس سے نمازیوں کی
نماز میں خلل پڑتا ہے اور دوسرے معتکفین کی یک سوئی بھی متاثر ہوتی ہے، یہ تمام باتیں
گناہ ہیں اگر کئی افراد مسجد میں ہوں تو ذکر وتلاوت بھی بلند آواز سے نہ کرنا چاہئے
(۷) بعض معتکفین مسجد کی بجلی اور پانی بے دریغ خرچ کرتے ہیں، ایسا کرنا غلط ہے
احتیاط سے استعمال کریں، اگر دوسرے معتکفین بھی ساتھ میں اعتکاف کر رہے ہوں
اور ان کے آرام کا وقت ہو تو پڑھنے لکھنے کے لیے بجلی جلانا بھی صحیح نہیں ہے، اس سے
انہیں تکلیف ہوگی، ضرورت ہو تو تیل لیمپ یا موم بتی وغیرہ استعمال کی جا سکتی ہے
(۸) دوسرے معتکفین کی چیزیں مثلاً صابن وغیرہ بھی ان کی اجازت کے بغیر استعمال
کرنا جائز نہیں ہے (۹) اعتکاف میں مسجد کا کوئی حصہ متعین کرنا ضروری نہیں ہے، جگہ
تبدیل کی جا سکتی ہے، بعض لوگ پہلے ہی سے اچھی جگہ پر قبضہ کر لیتے ہیں یا اچھی جگہ
حاصل کرنے کے لیے دوسروں سے لڑتے جھگڑتے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں
(۱۰) اعتکاف کی حالت میں اجرت یا تن خواہ پر کوئی کام کرنا مکروہ ہے، مثلاً کپڑے سینا
بال بنانا، تعلیم دینا، البتہ اگر کسی کی معاشی حالت مستحکم نہیں ہے اور وہ روزمرہ کی اجرت

پر ہی گزربسر کرتا ہے تو اس کو بعض فقہاء نے اجرت پر مسجد کے اندر کام کرنے کی اجازت دی ہے (الجوہرۃ النیرۃ: ۱/ ۱۷۵، امداد الفتاوی: ۲/ ۱۵۱، فتاوی رحیمیہ: ۷/ ۲۷۵)

حالت اعتکاف میں سگریٹ نوشی:

مسجد میں سگریٹ، بیڑی یا حقہ وغیرہ پینا جائز نہیں ہے، کیوں کہ ان کی بدبو سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے اور نمازی بھی اذیت محسوس کرتے ہیں، اعتکاف کی حالت میں مسجد سے نکل کر سگریٹ وغیرہ پینا بھی جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی کو شدید تقاضا ہو تو وہ پاخانہ پیشاب کے لیے آتے جاتے یا بیت الخلاء میں بیٹھ کر پی سکتا ہے نہ اس کام کے لیے خاص طور پر رکے اور نہ خاص طور پر بیت الخلاء میں دیر تک بیٹھا رہے، واپسی میں چلتے پھرتے کلی کرلینا اور الائچی وغیرہ منہ میں ڈال کر بدبو دور کرلینا ضروری ہے، اس کے لیے بھی مسجد سے باہر رکنا صحیح نہیں ہے، (فتاوی محمودیہ: ۱۰/ ۲۴۷) اصل میں یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں کہ انہیں کھانے کی طرح انسان کی طبعی ضروریات میں شمار کیا جاسکے، ویسے بھی یہ چیزیں شرعاً پسندیدہ نہیں ہیں، فتاوی دارالعلوم میں ہے کہ معتکف کا کھانا پینا مسجد میں ہوتا ہے لہذا باہر نکلنا بہ غرض حقہ نوشی جائز نہ ہوگا، باقی یہ کہ حقہ نوشی مسجد میں مکروہ ہے تو اس وجہ سے اس کو ترک اعتکاف کرنا چاہئے، کیوں کہ سنت کی ادائیگی کی وجہ سے ارتکاب مکروہ درست نہیں ہے (فتاوی دارالعلوم: ۶/ ۱۵۵) سگریٹ وغیرہ کے عادی لوگوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اعتکاف کا ارادہ نہ کریں اور اگر اعتکاف کریں تو مدت اعتکاف میں اس عادت پر کنٹرول کریں اور جب تک معتکف رہیں سگریٹ، بیڑی وغیرہ سے پرہیز کریں (کفایۃ المفتی: ۴/ ۲۴۵)

معتکف کس وقت باہر نکل سکتا ہے؟

(۱) معتکف کو پاخانے پیشاب کے لیے نکلنے کی اجازت ہے، مگر چند شرائط کے ساتھ، اس ضرورت کے لیے مسجد سے متصل بیت الخلاء ہو تو زیادہ بہتر ہے، اگر

قریب میں کوئی بیت الخلاء نہ ہو تو گھر بھی جاسکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو لیکن اس کام سے فراغت کے بعد فوراً واپسی ہونی چاہئے، راستے میں کسی کو سلام کرنا یا کسی کے سلام کا جواب دینا یا مختصر بات چیت کرنا جائز ہے، مگر رُک کر بات کرنا جائز نہیں، بیت الخلاء آتے جاتے تیز چلنے کی ضرورت نہیں ہے، اطمینان سے چلے اگر بیت الخلاء مشغول ہو تو باہر رُک کر انتظار کیا جاسکتا ہے، لیکن فراغت کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہرنا جائز نہیں ہے (احسن الفتاوی: ۴/ ۵۰۷، فتاوی عالمگیری: ۱/ ۳۱۳، طحطاوی: ۶۹۸)

(۲) اگر کسی پر غسل واجب ہو جائے تو اس سے اعتکاف پر کوئی فرق نہیں پڑتا، مسجد سے باہر نکل کر غسل کرلینا چاہئے، بلکہ باہر نکلنے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ تیمم کرلے تاکہ مسجد میں ناپاک حالت کے ساتھ نہ ٹھہرنا پڑے، اگر مسجد میں غسل کا انتظام ہے تو وہاں غسل کرے ورنہ گھر بھی جاسکتا ہے، جانے آنے میں اس کی بھی وہی تفصیلات ہیں جو قضائے حاجت کے سلسلے میں بیان کی گئیں، واجب غسل کے علاوہ کسی اور غسل (مثلاً جمعہ کے غسل) کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے (امداد الفتاوی: ۲/ ۱۵۵، فتاوی رحیمیہ: ۵/ ۲۷۶)

(۳) اگر مسجد میں وضو کا نظم نہیں ہے تو اس کام کے لیے مسجد سے باہر جاسکتا ہے، چاہے مسجد کے وضو خانے میں جائے جو عموماً مسجد کے باہر بنا ہوا ہوتا ہے یا کسی قریبی جگہ جاکر وضو کرے، صرف فرض نماز ہی کے لیے نہیں بلکہ نوافل کے لیے یا قرآن کریم ہاتھ میں لے کر تلاوت وغیرہ کے لیے بھی وضو کا یہی حکم ہے، لیکن اگر بغیر دیکھے تلاوت کرنی ہو، یا تسبیح وغیرہ پڑھنی ہو تو اس کے لیے وضو کرنے کے لیے نکلنا جائز نہیں ہے، تازہ وضو بنانے کے لیے بھی مسجد سے باہر نکلنا جائز نہیں ہے، وضو میں مسواک، منجن، صابن اور تولیہ وغیرہ کا استعمال درست ہے۔ (فتاوی شامی: ۳/ ۴۳۷، فتاوی رحیمیہ: ۷/ ۲۷۵)

معتکف کیا کام کرسکتا ہے؟ (کچھ اور مسائل)

(۱) اگر کوئی شخص کھانا لانے والا نہیں ہے تو معتکف خود نکل کر کھانا لاسکتا ہے چاہے گھر سے یا ہوٹل وغیرہ سے خرید کر، خواہ گھر اور ہوٹل کتنی ہی دور کیوں نہ واقع ہو البتہ راستے میں کہیں نہ رکے، اس بات کا خیال رکھے کہ کھانے کا انتظار نہ کرنا پڑے اگر بھیڑ یا کسی اور وجہ سے انتظار بھی کرنا پڑ جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن کھانا مسجد ہی میں لاکر کھانا چاہیے، مسجد حرام کے معتکفین مسجد کے اندر کھانا نہیں کھاسکتے، ایسے لوگوں کو اجازت ہے کہ وہ باہر کھا کر آجائیں (کفایۃ المفتی: ۴/ ۲۴۵ احسن الفتاوی: ۴/ ۵۰۷ البحر الرائق: ۲/ ۵۲۲)

(۲) معتکف اگر کسی ایسی مسجد میں اعتکاف کررہا ہے جہاں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی تو اسے نماز جمعہ کے لیے مسجد سے باہر نکلنا جائز ہے، لیکن اس مقصد کے لیے بہت پہلے نہ نکلے، بلکہ اتنے پہلے نکلے کہ اسے جامع مسجد میں پہنچ کر چار رکعت سنت ادا کرنے کا موقع مل جائے، جمعہ کی نماز کے بعد اسی مسجد میں سنتیں بھی ادا کی جاسکتی ہیں، البتہ مسجد میں زیادہ دیر ٹھہرنے (مثلاً کوئی شخص وعظ سننے لگا یا تلاوت میں مشغول ہوگیا) سے اعتکاف نہیں ٹوٹے گا، کیوں کہ وہ مسجد ہی کے اندر ہے۔ تاہم بلاضرورت مسجد کے اندر نہ رہے (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۱۳)

(۳) ان طبعی اور شرعی ضرورتوں کے لیے مسجد سے باہر جانے کی اجازت تو ہے مگر اس سلسلے میں سخت احتیاط بھی ضروری ہے، ذرا سی بے احتیاطی سے اعتکاف فاسد ہوسکتا ہے، مثال کے طور پر راستے میں کسی جگہ ٹھہر کر سلام دعا یا بات چیت نہ کرے، ہاں چلتے چلتے بات چیت کرسکتا ہو تو کرلے، اگر مزاج پرسی یا سلام دُعا کے لیے ایک منٹ بھی رک جائے گا تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا، راستے میں اگر کوئی جنازہ مل جائے اور وہ ٹھیک اس کی مسجد کے راستے میں ہے ذرا بھی ادھر ادھر ہٹنے کی

ضرورت پیش نہیں آتی اس صورت میں نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، مگر اس کے لیے رُک کر انتظار کرنے سے اعتکاف فاسد ہوجائے گا، نماز ختم ہوتے ہی واپسی بھی شرط ہے، ایک منٹ کے لیے بھی اگر مسجد سے باہر چلا گیا خواہ بھول کر یا جان بوجھ کر تو اعتکاف فاسد ہوجائے گا، بعض کام معمولی ہوتے ہیں مثلاً کلی کرنا یا ہاتھ دھونا یا مسجد کا بیرونی دروازہ بند کرنا وغیرہ، معتکف یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں کچھ وقت تو لگتا نہیں اور وہ مسجد کے اندر سے نکل کر یہ کام کرلیتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہئے کہ ایسا کرنے سے اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے، ہاں اگر اس طرح کے کسی کام کے لیے صرف سر باہر نکالے اور پورا دھڑ مسجد کے اندر ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔
(فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۶)

اعتکاف کن چیزوں سے فاسد ہوتا ہے؟

(۱) شرعی ضرورتوں جیسے نماز جمعہ، طبعی ضرورتوں جیسے کھانا پینا پیشاب پاخانہ یا غسل جنابت کے علاوہ کسی کام کے لیے مسجد سے باہر نکلنا، خواہ غلطی سے نکلے یا جان بوجھ کر، دن میں نکلے یا رات میں اعتکاف فاسد ہوجاتا ہے، دوا لینے کے لیے بھی جانے کی اجازت نہیں ہے، دوا لینی ہے تو کسی کو بھیج کر منگوائے، ڈاکٹر کو مسجد میں بھی بلایا جاسکتا ہے۔ (۲) غیر واجب غسل مثلاً جمعہ کے لیے یا محض ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے مسجد سے نکلنا (۳) میت کو نہلانے، کفنانے، نماز جنازہ پڑھانے یا دفن میں شرکت کے لیے جانا (۴) معتکف کو زبردستی مسجد سے باہر کردینا (۵) صحبت کرلینا خواہ دن میں ہو یا رات میں بھول کر ہو یا جان بوجھ کر انزال ہو یا نہ ہو (۶) گرمی، سردی سے بچنے کے لیے مسجد سے باہر چلے جانا (۷) قصداً روزہ توڑ دینا، روزہ فاسد ہوجانے سے اعتکاف بھی فاسد ہوجاتا ہے (۸) ایک دن رات سے زیادہ مدت تک بے ہوش رہنا، یا پاگل ہوجانا (فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۶)

کن صورتوں میں اعتکاف توڑ سکتے ہیں:

کبھی کبھی معتکف اعتکاف ختم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اگر ایسی ضرورت پیش آجائے اور اعتکاف توڑنا پڑے تو شرعاً اس کی گنجائش ہے، اس صورت میں معتکف پر کوئی گناہ بھی نہیں ہوگا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مجبوری میں نماز یا روزہ توڑ دیا جائے، وہ چند ممکنہ صورتیں جن میں اعتکاف توڑا جاسکتا ہے یہ ہیں (۱) اعتکاف کے دوران کوئی ایسا مرض لاحق ہوگیا کہ اس کا علاج مسجد میں رہ کر ممکن نہ ہو یا کوئی دوا لانے والا نہ ہو، یا اتنا سخت بیمار ہوگیا ہو کہ گھر جائے بغیر چارہ نہ ہو، (۲) کسی وجہ سے روزہ توڑنا پڑ جائے تب بھی اعتکاف ختم ہو جاتا ہے، کیوں کہ مسنون اعتکاف کے ساتھ روزہ شرط ہے (۳) معتکف کو مسجد میں جان و مال کا خطرہ لاحق ہو، یا خود تو محفوظ ہو مگر اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر والوں کی جان، مال اور آبرو کو خطرہ لاحق ہو جائے اور اعتکاف میں رہ کر اس خطرے کا تدارک ممکن نہ ہو (۴) حکومت کی طرف سے گرفتاری کا حکم آجائے (۵) کسی ڈوبتے یا جلتے ہوئے آدمی کو بچانے کے لیے یا آگ بجھانے کے لیے بھی باہر نکلا جاسکتا ہے، اس سے بھی اعتکاف فاسد ہو جائے گا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص نماز میں ہو اور کوئی نابینا شخص کنویں میں گرنے کے قریب ہو تو اسے بچانے کے لیے نماز توڑی جاسکتی ہے (۶) معتکف کے متعلقین میں سے کوئی سخت بیمار ہے اور دوسرا کوئی تیمار دار نہیں ہے یا کسی قریبی عزیز کی وفات ہوگئی ہو تو اعتکاف توڑا جاسکتا ہے۔ (فتاویٰ شامی: ۳/۳۸۶، البحر الرائق: ۲/۵۲۲)

حدودِ مسجد کی تفصیل:

مسجد کے جو مقامات نماز کے لیے خاص ہیں وہ مسجد کے اندر داخل ہیں، جیسے محراب مسجد، مسجد کا ہال، برآمدہ، مسجد کا صحن وغیرہ باقی جگہیں مسجد میں داخل نہیں ہیں جیسے وضو خانہ، حوض (اگر وہ مسجد کے صحن میں نہ ہو) غسل خانے، امام مؤذن کے

کمرے، راہ داریاں، بچوں کی تعلیم کے لیے بنائے گئے کمرے وغیرہ، مسجد کی چھت بھی مسجد کے ہی حکم میں ہے بہ شرطیکہ اس کا راستہ باہر سے نہ ہو، اگر کئی منزلہ مسجد ہے تو ہر منزل مسجد کے حکم میں ہے کسی بھی منزل پر اعتکاف کرسکتا ہے یا آجا سکتا ہے، مسجد کی دیواریں بھی حدودِ مسجد میں داخل ہیں، ان پر چڑھنا بھی جائز ہے۔ (البحر الرائق: ۲/۵۲۲)

اعتکاف کی قضا کیسے ہوگی؟

مسنون اعتکاف شروع کرنے کے بعد ٹوٹ جائے تو اس کی قضا ضروری ہے، محض توبہ واستغفار کافی نہیں ہے، اعتکاف خواہ غلطی سے ٹوٹا ہو، یا جان بوجھ کر مجبوری میں ٹوٹا ہو یا بغیر مجبوری کے، اختیار سے توڑا ہو یا غیر اختیاری طور پر ٹوٹ گیا ہو سب میں قضا ہے، جس دن کا اعتکاف ٹوٹا ہے اسی دن کی قضا واجب ہوگی، اگر دن میں ٹوٹا تو صبح صادق سے غروب آفتاب تک روزہ رکھ کر مسجد میں رہے، رات میں ٹوٹا ہے تو ایک رات اور اگلا پورا دن مسجد میں گزارے، قضا اعتکاف کے ساتھ بھی روزہ رکھنا ضروری ہے، اگر کسی پر اعتکاف کی قضا واجب تھی اور اس نے اتنی تاخیر کردی کہ اب ضعف یا بیماری کی وجہ سے روزہ رکھ کر قضا کرنا ممکن نہیں رہا تو اس صورت میں اعتکاف کا فدیہ دیا جائے گا جو ایک صدقۂ فطر کے برابر ہے۔ (بدائع الصنائع: ۲/۲۸۸، فتاویٰ عالمگیری: ۱/۳۱۳)

خواتین کا اعتکاف:

مردوں کی طرح خواتین بھی اعتکاف کرسکتی ہیں اور اس عبادت کی فضیلت حاصل کرسکتی ہیں، لیکن عورتیں اپنے گھروں میں اعتکاف کریں اور اس مقصد کے لیے گھر میں اس جگہ کو مخصوص کرلیں جہاں نمازیں پڑھی جاتی ہیں، اگر گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ ہو تو کسی کونے میں بیٹھ جائیں اور اسی جگہ کو اعتکاف کے لیے مخصوص کرلیں مردوں کی بہ نسبت عورتوں کے لیے اعتکاف کی سنت ادا کرنا زیادہ سہل ہے، وہ بیٹھے

بیٹھے گھر کے کاموں کی نگرانی بھی کر سکتی ہیں اور اعتکاف بھی جاری رکھ سکتی ہیں، اس کے باوجود عورتیں اعتکاف کا اہتمام نہیں کرتیں اور ایک عظیم سنت سے محروم رہ جاتی ہیں، یہ بڑے افسوس کا مقام ہے، روایات میں ہے کہ ازواج مطہراتؓ اپنے حجروں میں اعتکاف فرمایا کرتی تھیں، ایک حدیث میں ہے کہ عورتوں کے لیے بہترین مسجد ان کے گھروں کا اندرونی حصہ ہے، (مسند احمد بن حنبل: ۶/ ۲۹۷، رقم الحدیث: ۲۶۵۸۴، صحیح ابن خزیمہ: ۳/۹۲، رقم الحدیث: ۱۶۸۳) شادی شدہ عورتوں کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہروں کی اجازت کے بغیر اعتکاف نہ کریں، کیوں کہ ان کی اجازت کے بغیر اعتکاف کرنا جائز نہیں ہے، البتہ شوہروں کو چاہئے کہ وہ عورتوں کو اجازت دے دیا کریں، خواہ مخواہ انہیں ثواب سے محروم نہ کریں، اگر کسی عورت نے شوہر کی اجازت سے اعتکاف شروع کیا، بعد میں اس نے اجازت واپس لے لی اب بیوی کے لئے اس کی تعمیل ضروری نہیں ہے اسے اعتکاف پورا کرنا چاہئے، عورت کے اعتکاف کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ وہ حیض ونفاس سے پاک ہو، یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ اعتکاف کی تاریخوں میں ایام شروع نہ ہوں، اگر اعتکاف کے دوران حیض آگیا تو اعتکاف چھوڑ دینا چاہئے اور جس دن حیض شروع ہوا ہے اس کی قضا بعد میں کرلینی چاہئے، جو جگہ اعتکاف کے لیے گھر میں متعین کرلی گئی ہے اس کا حکم وہی ہے جو مسجد کا ہے، بلا ضرورت اس جگہ سے اٹھ کر جانا جائز نہیں، جائے گی تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا، عورتوں کے لیے بھی اعتکاف کی جگہ سے ہٹنے کے وہی احکام ہیں جو مردوں کے ہیں، جن ضروریات کی وجہ سے مرد مسجد سے باہر نکل سکتے ہیں انہی ضرورتوں کی وجہ سے عورتیں بھی نکل سکتی ہیں، جن کاموں کے لیے مردوں کو باہر نکلنا جائز نہیں ان کاموں کے لئے عورتوں کو بھی اپنی جگہ سے اٹھنا جائز نہیں ہے۔ (فتاوی شامی: ۳/ ۳۸۶ فتاوی عالمگیری: ۱/ ۲۱۱، خیر الفتاوی: ۴/۱۴۲)

شب قدر کی فضیلت:

یہ بڑی مبارک رات ہے، قرآن کریم میں پوری ایک سورت اس کی فضیلت میں نازل ہوئی ہے اور اس میں اس رات کو ایک ہزار راتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے، قدر کے معنی ہیں، عظمت وشرف، اس رات کو لیلۃ القدر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اسے دوسری راتوں کے مقابلے میں شرف اور عظمت حاصل ہے، بعض علماء نے اس کا یہ مفہوم بھی بتلایا ہے کہ جس شخص کی اس سے پہلے اپنی بے عملی کے باعث کوئی قدر وقیمت نہ تھی اس رات میں عبادت اور توبہ واستغفار کرکے وہ صاحب قدر ومنزلت بن گیا ہے، قدر کے دوسرے معنی تقدیر اور حکم کے بھی ہیں، اس لحاظ سے لیلۃ القدر کہنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اس رات میں تمام مخلوقات کے لیے جو کچھ تقدیر ازلی میں لکھا ہوا ہے اس کا وہ حصہ جو اس رمضان سے اگلے رمضان تک پیش آنے والا ہے ان فرشتوں کے حوالے کردیا جاتا ہے جو کائنات کی تدبیر اور تنفیذ امور کے لیے مامور ہیں، تقدیر ازلی میں عمر، موت، رزق، بارش وغیرہ سب کچھ ہے، یہاں تک کہ یہ بھی بتلا دیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو اس سال حج نصیب ہوگا (معارف القرآن: ۸/ ۷۹۱) قرآن کریم میں اس رات کی چار فضیلتیں بیان کی گئی ہیں (۱) اس رات میں قرآن پاک نازل ہوا (۲) یہ رات ہزار مہینوں سے افضل ہے (۳) اس رات میں فرشتے اترتے ہیں (۴) اس رات میں صبح صادق تک خیر وبرکت اور امن وسلامتی کی بارش ہوتی ہے۔

اس سورت کے علاوہ بھی دوسری آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا نزول شب قدر میں ہوا ہے، فرمایا: اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ، فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ "ہم نے اس کتاب کو ایک مبارک رات میں اتارا ہم (اس کے ذریعے بندوں کو) آگاہ کرنے والے تھے، اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ ہمارے حکم سے طے کیا جاتا ہے (الدخان ۳، ۴) اس آیت میں بھی جمہور مفسرین کے نزدیک

شب قدر ہی مراد ہے، اس رات کو مبارک فرمانا اس اعتبار سے ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں پر بے شمار برکتیں نازل ہوتی ہیں، قرآن کریم کے شب قدر میں نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے پورا قرآن سماءِ دنیا پر اسی رات میں نازل کردیا گیا، پھر تیئیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا، بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ ہر سال میں جتنا قرآن نازل کرنا مقصود ہوتا اتنا حصہ شب قدر میں لوح محفوظ سے سماءِ دنیا پر نازل کردیا جاتا (معارف القرآن: ۷/۷۵۶) اس رات میں فرشتے زمین پر اترتے ہیں، ایک روایت میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب شب قدر آتی ہے تو جبرئیل علیہ السلام ملائکہ کی ایک جماعت کے ساتھ اترتے ہیں اور ان تمام لوگوں کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں جو (اس رات) میں کھڑے ہوئے یا بیٹھے ہوئے ذکر اللہ میں مصروف ہوں (البیہقی فی شعب الایمان: ۳/۳۴۳، رقم الحدیث: ۳۷۱۷) ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب شب قدر ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیتے ہیں وہ فرشتوں کے جھرمٹ میں زمین پر اترتے ہیں، وہ فرشتے ہر اس بندے کو سلام کرتے ہیں جو کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا ذکر اللہ میں مشغول ہو، ان لوگوں سے مصافحہ کرتے ہیں اور ان کی دعاؤں پر آمین کہتے ہیں، یہاں تک کہ صبح ہوجاتی ہے، جبرئیل ان فرشتوں سے کہتے ہیں بس اب چلو، فرشتے پوچھتے ہیں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا جبرئیل کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی رحمت سے معاف کردیا ہے، سوائے چار شخصوں کے (۱) عادتاً شراب پینے والا (۲) والدین کا نافرمان (۳) قطع رحمی کرنے والا (۴) کینہ پرور (البیہقی فی شعب الایمان: ۳/۳۳۵، رقم الحدیث: ۳۶۹۵) اس رات کی سب سے بڑی فضیلت تو وہی ہے جو اس سورت میں بیان ہوئی ہے کہ ایک رات کی عبادت ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے

گویا ایک رات کی عبادت تراسی سال کی عبادت سے بھی بہتر ہے، پھر بہتر ہونے کی کوئی حد مقرر نہیں ہے، کتنی بہتر ہے دوگنی چوگنی، دس گنی، سوگنی وغیرہ سب احتمالات ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص شب قدر میں عبادت کے لیے ایمان واخلاص کے ساتھ کھڑا رہا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو گئے۔ (بخاری: ۱/۲۱، رقم الحدیث: ۳۵، مسلم: ۱/۵۲۳، رقم الحدیث: ۷۶۰)

شب قدر کس رات میں ہے؟

یہ بات تو متعین ہے کہ شب قدر رمضان المبارک کے مہینے میں آتی ہے، مگر کس رات میں ہے یہ متعین نہیں ہے، اس سلسلے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں صاحب تفسیر مظہری نے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ شب قدر رمضان المبارک کے آخری عشرے میں ہوتی ہے، مگر آخری عشرے کی کوئی خاص تاریخ متعین نہیں ہے بلکہ ان میں سے کسی بھی رات میں ہوسکتی ہے اور ہر رمضان میں بدلتی بھی رہتی ہے، ان دس راتوں میں سے خاص طاق راتوں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹، میں ہونے کا از روئے احادیث صحیحہ زیادہ احتمال ہے، اس قول میں تمام احادیث جو شب قدر کی تعین کے متعلق موجود ہیں سب جمع ہو جاتی ہیں، اگر شب قدر کو ان راتوں میں دائر اور ہر رمضان میں بدلنے والی رات مانا جائے تو یہ تمام روایاتِ حدیث اپنی اپنی جگہ درست ثابت ہو جاتی ہیں اور کسی تاویل کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اسی لیے اکثر ائمہ فقہاء نے اس رات کو عشرۂ اخیرہ کی طاق راتوں میں منتقل ہونے والی رات قرار دیا ہے ابو قلابہ، امام مالک، احمد بن حنبل، سفیان ثوری، اسحاق بن راہویہ، ابو ثور، مزنی ابن خزیمہ، وغیرہ رحمہم اللہ سب نے یہی فرمایا ہے، صرف امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ یہ رات بدلنے والی نہیں ہے بلکہ متعین ہے، صحیح بخاری میں حضرت عائشہ الصدیقہؓ کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تحروا ليلة القدر في

العشر الاواخر من رمضان (بخاری: ۲/۷۱۰، رقم الحدیث: ۱۹۱۶)
یعنی شب قدر کو رمضان کے آخری عشرے میں تلاش کیا کرو، صحیح مسلم میں حضرت سفیان ابن عیینہؒ کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: فاطلبوها فی الوتر منها (مسلم: ۲/۸۲۲، رقم الحدیث: ۱۱۶۵) یعنی شب قدر کو رمضان کے عشرۂ اخیر کی طاق رات میں تلاش کرو (تفسیر مظہری بحوالہ معارف القرآن: ۸/۷۹۲) حضرت مولانا محمد تقی عثمانی نے لکھا ہے کہ "جمہور کا مسلک یہ ہے کہ وہ رمضان کے آخری عشرے بالخصوص عشرے کی طاق راتوں میں گھومتی رہتی ہے، کسی سال کسی رات میں اور کسی سال کس دوسری رات میں، پھر اس میں اختلاف ہوا کہ ان میں سے کون سی رات میں اس کی زیادہ امید ہے، بعض نے اکیسویں رات کو راجح قرار دیا ہے، بعض نے تیئسویں رات کو، لیکن اکثر حضرات کی رائے یہ ہے کہ رمضان کی ستائیسویں تاریخ کو شب قدر کا زیادہ امکان ہے (درس ترمذی: ۲/۶۳۵) علماء نے لکھا ہے کہ شب قدر کو کئی مصلحتوں اور حکمتوں کی وجہ سے مخفی رکھا گیا ہے، اگر تعیین باقی رہتی تو بہت سے لوگ دوسری راتوں کا اہتمام بالکل چھوڑ دیتے، متعین نہ ہونے کی صورت میں کم از کم پانچ راتوں میں عبادت کی توفیق ہو جاتی ہے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو گناہ کیے بغیر نہیں رہتے، متعین کرنے کی صورت میں اگر شب قدر کے معلوم ہونے کے باوجود کوئی شخص گناہ کا مرتکب ہوتا تو یہ بڑی خطرناک بات ہوتی متعین ہونے کی صورت میں اگر کسی شخص سے یہ رات اتفاقی طور پر چھوٹ جاتی تو آئندہ راتوں میں وہ افسردگی کی وجہ سے عبادت نہ کر پاتا، جتنی راتیں طلب وجستجو میں صرف ہوتی ہیں سب کا مستقل ثواب ملتا ہے (ماہ رمضان کے فضائل واحکام: ۲۶۰)

شب قدر سے محروم نہ ہوں:

یہ رات سال میں صرف ایک مرتبہ آتی ہے اس رات کی برکتوں سے محروم رہ

جانا بڑی حرماں نصیبی ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے متعلق جو اس رات کی عبادت سے اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی سعادت سے محروم رہ جاتے ہیں، ارشاد فرمایا ہے کہ تمہارے پاس ایک مہینہ آیا ہے جس میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے، جو شخص اس رات سے محروم رہ گیا گویا وہ ہر خیر سے محروم رہ گیا اور اس رات کے خیر سے وہی شخص محروم رہتا ہے جو حقیقت میں محروم ہے۔
(ابن ماجہ: ۱/۵۲۶، رقم الحدیث: ۱۶۴۴)

شب قدر کی عبادت:

رہی یہ بات کہ ان راتوں میں کون سی عبادت کرنا زیادہ بہتر ہے، اس سلسلے میں بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس رات میں سب سے بہتر عبادت نفلیں پڑھنا ہے کیوں کہ اکثر روایات میں قیام کی فضیلت آئی ہے اور قیام نفلوں میں ہوتا ہے، حضرت سفیان ثوریؒ کی رائے یہ ہے کہ اس رات میں دعا کی عبادت زیادہ بہتر ہے کیوں کہ اس رات میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ الصدیقہؓ کو دعا کی تلقین فرمائی تھی ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر مجھے شب قدر کا پتہ چل جائے تو میں کیا دعا مانگوں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دعا مانگو: اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّی اے اللہ آپ بے شک بہت معاف کرنے والے ہیں، معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں مجھے معاف فرما دیجئے۔ (ابن ماجہ: ۲/۱۲۶۵، رقم الحدیث: ۳۸۵۰) ابن رجب حنبلیؒ کہتے ہیں کہ صرف دعا ہی پر اکتفا نہ کرے، بلکہ مختلف عبادتوں میں جمع کرنا افضل ہے تلاوت، نماز، دعا، تسبیحات وغیرہ میں مشغول رہے، کیوں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس رات میں یہ تمام عبادات منقول ہیں (فضائل اعمال: ۶۱۳)

شب قدر کی عبادت کہاں کی جائے؟

شب قدر میں صرف جاگنا کافی نہیں ہے، بلکہ بیدار رہ کر عبادت کرنا بھی

ضروری ہے، اسی وقت شب قدر کی برکات سے مستفیض ہوا جاسکتا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ شب قدر کی عبادت تنہا اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہوئے کی جائے، فقہاء نے فضیلت کی راتوں میں مسجدوں میں جمع ہونے کو مکروہ اور بدعت فرمایا ہے (البحر الرائق: ۲/۵۲) آج کل رمضان کی طاق راتوں میں خاص طور پر ستائیسویں شب میں مساجد کھول دی جاتی ہیں، انہیں قمقموں سے روشن، اور مزین کیا جاتا ہے لوگ مسجدوں میں آکر جاگتے ہیں، چائے اور کھانے پینے کی چیزیں فراہم کی جاتی ہیں، یہ سب خرافات ہیں ان سے بچنا چاہئے اور گھر میں رہ کر عبادت کا مزاج بنانا چاہئے۔

زکوۃ کی فضیلت واہمیت:

زکوۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے، نماز اور روزے کی طرح یہ بھی ایک فرض عبادت ہے، قرآن کریم میں ۸۲/ جگہوں پر نماز کے ساتھ زکوۃ کا ذکر کیا گیا ہے، اور تنہا زکوۃ کا ذکر ان کے علاوہ ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں زکوۃ کی کس قدر اہمیت ہے ایک جگہ فرمایا گیا: هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ، الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ، اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (لقمان: ۳-۵) ”ہدایت اور رحمت ہے ان نیک لوگوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں زکوۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، یہی لوگ اپنے رب کی طرف صحیح ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں“ جو لوگ زکوۃ ادا نہیں کرتے اور مال کی محبت میں اس قدر گرفتار رہتے ہیں کہ جو فریضہ اللہ نے ان کے مال میں متعین کردیا ہے اس کی ادائیگی سے پہلوتہی کرتے ہیں ان کے لیے قرآن کریم میں سخت ترین وعید ہے، ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا

مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (التوبة: ۳۴-۳۵) ”جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دیجئے جس دن اسے (سونے چاندی کو) دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان (مال و دولت والوں) کی پیشانیوں، پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے جو تم نے جمع کیا تھا اب اپنے جمع کردہ خزانے کا مزہ چکھو“ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا کے لفظ سے اس طرف اشارہ ہوگیا کہ جو لوگ بہ قدر ضرورت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، تو باقی ماندہ مال کے لیے یہ وعید نہیں ہے، اس کی تائید حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس مال کی زکوۃ ادا کردی جائے وہ كَنَزْتُمْ میں داخل نہیں ہے (سنن ابوداؤد کتاب الزکوۃ: ۲۱۸) اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات عین عمل جزاء عمل بنا دیا جاتا ہے، جیسا کہ یہاں ہے کہ جو سرمایہ ناجائز طور پر جمع کیا گیا تھا یا سرمایہ تو جائز تھا مگر اس کی زکوۃ ادا نہیں کی گئی تھی وہ سرمایہ خود سرمایہ داروں کے لیے عذاب بن گیا، یہاں ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ تپتے ہوئے سونے چاندی سے داغ لگانے کے لیے جسم کے تین حصوں کا انتخاب کیا گیا ہے، پیشانی، پہلو اور پیٹھ، ان تین اعضائے بدن کی تخصیص اس لیے کی گئی ہے کہ جب کوئی سائل یا زکوۃ کا طلب گار اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو دیکھ کر سب سے پہلے اس کی پیشانی پر بل پڑتے ہیں، پھر اس سے نظر بچانے کے لیے وہ دائیں یا بائیں مڑتا ہے، اس پر بھی سائل نہ چھوڑے تو اس کی طرف پشت کرلیتا ہے (معارف القرآن: ۴/۳۶۳) ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (آل عمران: ۱۸۰) ”اور ہرگز نہ خیال

کریں ایسے لوگ جو اس چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات ان کے لیے کچھ اچھی ہوگی (ہرگز نہیں) بلکہ یہ بات ان کے لیے بہت ہی بری ہے وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنائے جائیں گے اس مال کا جس میں انہوں نے بخل کیا تھا'' بخل کی جو سزا اس آیت کریمہ میں بیان کی گئی ہے اس سزا کی تفصیل حضرت ابوہریرہؓ کی اس روایت میں مذکور ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کو اللہ نے مال عطا کیا پھر اس نے اس میں زکوۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے روز یہ مال ایک سخت زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے میں طوق کی طرح ڈال دیا جائے گا وہ اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی (نسائی: ۵/۳۹، رقم الحدیث: ۲۴۸۲)

ادیان سابقہ میں زکوۃ:

زکوۃ اسلام میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، سابقہ شریعتوں میں بھی زکوۃ مشروع تھی چناں چہ قرآن کریم میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ﴾ (الانبیاء: ۷۳) ''اور ہم نے ان کو نیک کام کرنے کا نماز قائم کرنے کا اور زکوۃ دینے کا حکم دیا'' اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے دوسرے فرزند حضرت اسماعیل کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: ﴿ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ﴾ (مریم: ۵۵) ''اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیا کرتے تھے'' ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شریعتوں میں زکوۃ کا حکم موجود تھا اس کی نوعیت کیا تھی اور طریقۂ کار کیا تھا اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا، اسلام نے زکوۃ کے حکم کو نہ صرف یہ کہ باقی رکھا ہے بلکہ اسے ایک باضابطہ شکل بھی دی ہے۔

زکوۃ کی فرضیت:

ایک قول کے مطابق زکوۃ کی فرضیت مکے میں ہو چکی تھی، چناں چہ سورۂ مزمل کی آخری آیت میں و آتوا الزکوۃ کا حکم بھی موجود ہے، مشہور اور راجح قول یہی ہے کہ زکوۃ ۲ھ میں فرض ہوئی، اسی لیے بعض علماء کہتے ہیں کہ اگرچہ سورۂ مزمل مکی ہے مگر یہ آخری آیت مدنی ہے، لیکن سورۂ مومنون، نمل اور لقمان کی ابتدائی آیتوں میں بھی زکوۃ کا حکم موجود ہے جب کہ یہ تینوں صورتیں بھی مکی ہیں، ان آیتوں کے متعلق بھی یہی کہنا پڑے گا کہ یہ مدنی ہیں، باقی آیات مکے میں نازل ہوئیں، اس سلسلے میں مشہور مفسر حافظ ابن کثیرؒ کی رائے قرین عقل ہے کہ شاید زکوۃ تو مکہ مکرمہ میں اوائل اسلام میں ہی فرض ہوگئی ہو مگر اس کے نصاب اور مقدار واجب کی تفصیلات مدینہ طیبہ میں ہجرت کے دوسرے سال میں بیان کی گئیں ہوں، تفسیر روح المعانی میں بھی یہی قول اختیار کیا گیا ہے، ابتدائے اسلام میں لوگ اپنے مال کی زکوۃ لاکر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا کرتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے بے ساختہ طور پر ان کے لیے دعائیں نکلتی تھیں، چناں چہ صحابۂ کرام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں حاصل کرنے کے لیے زکوۃ پیش کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، ایسے ہی حضرات کے متعلق یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ﴾ (التوبۃ: ۹۹) ''اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اللہ کے قرب کا ذریعہ اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا لینے کا ذریعہ بناتے ہیں'' اس طرح یہ زکوۃ نادار مہاجرین صحابہ کی ضروریات زندگی کے لیے اہمیت اختیار کر گئی تھی، مال دار صحابہؓ صدقہ و زکوۃ سے خود بھی غریب صحابہؓ کی مدد کیا کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں بھی پیش کر دیا کرتے تھے، اس وقت تک زکوۃ کی وصولی کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا

یہاں تک کہ ۹ھ میں یہ آیت نازل ہوئی: خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (التوبۃ:۱۰۳) ”آپ ان کے مالوں میں صدقہ لے لیجیے جس کے ذریعے سے آپ ان کو پاک وصاف کردیں گے“

زکوۃ کا مقصد:

سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ زکوۃ کا مقصد مال داروں کے قلب کی تطہیر وتزکیہ ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ کی آیت (۱۰۳) میں یہ مقصد واضح کیا گیا ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ زکوۃ کے ذریعے وہ زکوۃ دینے والوں کو گناہوں سے پاک کردے، اور ان کے دل مال کی حرص ومحبت سے پیدا ہونے والے اخلاقی رذائل سے پاک وصاف ہوجائیں، اگرچہ زکوۃ کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے قوم کے ان نادار اور غریب لوگوں کی مدد ہوتی ہے جو عارضی یا مستقل اسباب کی بنا پر اپنی ضروریات زندگی فراہم کرنے سے عاجز رہتے ہیں، جیسے یتیم بچے، بیوہ عورتیں، معذور افراد، عام فقراء ومساکین اور اسی طرح کے دوسرے لوگ، زکوۃ ان لوگوں کی اعانت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، مگر مذکورہ آیت میں اس مقصد کا ذکر نہیں ہے، اس سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ زکوۃ کا اصل مقصد دراصل یہی ایک فائدہ ہے، دوسرے فوائد اگر اس فریضے کی ادائیگی سے حاصل ہوتے ہیں تو وہ ضمناً ہوتے ہیں، پہلی شریعتوں میں زکوۃ کا کوئی مصرف نہیں تھا، بلکہ طریقہ یہ تھا کہ جو مال زکوۃ کے طور پر وصول ہوتا اسے کسی میدان وغیرہ میں جمع کردیا جاتا اور آسمانی بجلی آکر اسے خاکستر کردیتی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ سے شریعت کا اصل مقصد خود صاحب مال کی اصلاح اور تطہیر ہے معاشرے کے افراد کی خدمت واعانت ثانوی درجے میں ہے اور یہ صرف اس امت کی خصوصیت ہے کہ جو مال زکوۃ کے طور پر نکالا جارہا ہے اسے امت کے فقراء اور مساکین کے لیے جائز کردیا گیا ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ زکوۃ امت کے مال دار افراد پر فرض ہے، مگر تمام مال داروں پر نہیں ہے بلکہ ان میں کچھ شرائط کے ذریعے تخصیص کردی گئی ہے پہلی شرط تو یہ ہے کہ زکوۃ دینے والا بالغ ہو، نابالغ بچوں کی ملکیت میں کتنا ہی مال کیوں نہ ہوں اس پر یا اس کے سرپرستوں پر کوئی زکوۃ نہیں ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ زکوۃ دینے والا عاقل ہو، مجنوں پر زکوۃ نہیں ہے، آزاد ہو، غلام پر زکوۃ نہیں ہے، مالک ہو اگر کسی کے قبضے میں کوئی مال ہے اور وہ اس کا مالک نہیں ہے تو اس پر زکوۃ نہیں ہے، مال بہ قدر نصاب ہو، اگر مال نصاب سے کم ہو تو اس پر زکوۃ نہیں، مال ضروریات اصلیہ سے زائد ہو، اگر کسی کی ملکیت میں ایسی چیزیں ہیں جو انسان کی ضروریات زندگی میں داخل سمجھی جاتی ہیں جیسے رہائشی مکان، کپڑے، برتن، فرنیچر، گاڑی وغیرہ ان پر زکوۃ نہیں اس مال پر ایک سال مکمل گزر چکا ہو، ایک سال سے پہلے زکوۃ واجب نہیں ہوگی، مال نامی ہو یعنی بڑھنے والا ہو، جیسے سونا چاندی، تجارتی سامان، مویشی وغیرہ اور جو مال نامی نہیں ہے وہ اگر ضرورت سے زائد ہو تب بھی زکوۃ نہیں ہے، مثلاً کسی کے پاس کئی رہائشی مکانات ہوں متعدد گاڑیاں ہوں غیر ضروری برتن اور کپڑے وغیرہ ہوں، اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہر مال پر زکوۃ نہیں ہے، بلکہ اس مال پر زکوۃ ہے جو عادتاً بڑھتا رہتا ہے جیسے مال تجارت، مویشی یا سونا چاندی۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۱۷۲، بدائع الصنائع:۲/۷۸)

زکوۃ کا نصاب:

زکوۃ کی مقدار نصاب کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس مال پر زکوۃ ہے جو ایک سال گزرنے کے بعد اخراجات سے بچا ہوا ہو، اور ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا ان کی مالیت کے برابر ہو، اگر صرف سونا ہے تو سونے کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا، صرف چاندی ہے تو ساڑھے باون تولہ چاندی ہونا

ضروری ہے، دونوں ہیں تو چاندی کا نصاب معتبر ہوگا، یعنی اگر کسی کے پاس مثلاً ایک تولہ سونا ہے اور دو تین تولے چاندی ہے اور دونوں کی مجموعی قیمت میں ساڑھے باون تولہ چاندی آسکتی ہے تو اس پر زکوۃ ہے، ساڑھے سات تولہ سونا ۴۸۰:۸۷ گرام اور ساڑھے باون تولہ چاندی ۳۶۰:۶۱۲ گرام کے برابر ہے، اگر کسی کے پاس نقد رقم گھر میں ہو، بنک کے کھاتوں میں ہو، ڈاک خانے میں جمع ہو، بنک سارٹیفکٹ کی شکل میں ہو، شیئرز کی صورت میں ہو، کسی تجارتی کمپنی میں سرمایہ لگا ہوا ہو، غیر ملکی کرنسی کی صورت میں ہو، فیکٹری میں تیار یا خام مال کی شکل میں موجود ہو، مکان ودکان وغیرہ کی آمدنی کی شکل میں ہو سب پر زکوۃ ہے۔ اس مال کا ڈھائی فی صد حصہ بہ طور زکوۃ ادا کیا جائے گا۔ اگر کسی شخص پر قرض ہو تو قرض کی رقم منہا کرنے کے بعد بہ قدر نصاب مال بچ جانے پر زکوۃ ادا کی جائے گی، اور اگر کسی کو قرض دے رکھا ہے اور اس کے ملنے کی امید ہے تو اس کی بھی ہر سال زکوۃ ادا کرنی ہوگی خواہ وہ رقم کتنی ہی مدت میں کیوں نہ وصول ہو، کرائے پر اٹھائے گئے مکان، دوکان یا رہائش کے لیے خریدے ہوئے مکان یا پلاٹ وغیرہ پر کوئی زکوۃ نہیں ہے، البتہ ان کے کرائے سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اگر بہ قدر نصاب پہنچ جائے اور سال بھر گزر جائے تو اس پر زکوۃ ہوگی، تاہم تجارت کے لیے خریدے گئے زمین، مکان اور پلاٹ وغیرہ پر زکوۃ ہوگی اور مارکیٹ ریٹ کے اعتبار سے ان کی قیمت متعین کی جائے گی۔ (فتاوی عالمگیری: ۱/۱۷۲، فتاوی شامی: ۳/۱۷۱، احکام زکوۃ مولانا رفیع عثمانی، ص: ۲۵)

زکوۃ کے سلسلے میں سب سے اہم بات مستحق تک پہنچانا ہے، عموماً زکوۃ دینے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ زکوۃ کے مصارف کون ہیں، بسا اوقات بلا تحقیق ایسے لوگوں کو زکوۃ کا مالک بنا دیا جاتا ہے جو قرآن کریم کے بیان کردہ مصارف ہی نہیں ہوتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مستحق لوگ زکوۃ پر قابض ہو جاتے ہیں اور مستحق

محروم رہ جاتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ زکوۃ دینے والے یہ دیکھیں کہ زکوۃ کن لوگوں کی دی جانی چاہئے پھر یہ دیکھیں کہ جس شخص کو زکوۃ دے رہے ہیں وہ ان لوگوں میں شامل بھی ہے یا نہیں جن کو قرآن کریم نے زکوۃ کا مستحق قرار دیا ہے۔

زکوۃ کے مصارف:

قرآن کریم کی سورۂ توبہ میں مصارف زکوۃ متعین کر دیئے گئے ہیں، جو یہ ہیں (۱) فقراء (جو صاحب نصاب نہ ہوں) (۲) مساکین (جو کسی بھی مال کے مالک نہ ہوں) (۳) اسلامی حکومت کے وہ کارکن وملازمین جو زکوۃ کی وصولیابی پر متعین ہوں (۴) مؤلفۃ القلوب۔ جن کی دل جوئی مقصود ہو، یہ وہ لوگ ہیں جن کو اسلام سے مانوس کرنے کے لیے زکوۃ دے دی جاتی تھی، جمہور ائمہ کے نزدیک یہ مصرف منسوخ ہو چکا ہے (۵) ایسے غلام جو اپنی آزادی کے لیے مالی امداد چاہتے ہوں (۶) ایسے قرض دار جن کو قرض سے سبک دوشی کے لیے مدد کی ضرورت ہے (۷) فی سبیل اللہ اس میں کئی قسم کے لوگ داخل ہیں مثلاً مجاہد، حاجی، اہل علم اور اللہ کی راہ میں کام کرنے والے لیکن ان سب کے لیے فقر شرط ہے (۸) وہ مسافر جو سفر کے درمیان ضرورت مند ہو جائیں۔ (معارف القرآن: ۴/۳۹۲)

یاد رکھئے:

زکوۃ کے سلسلے میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ زکوۃ کی رقم حساب کر کے نہایت احتیاط کے ساتھ ادا کرنی چاہئے، اندازے سے زکوۃ نکالنے میں غلطی کا احتمال ہے، اگر زکوۃ زیادہ دے دی تو انشاء اللہ یہ مال ذخیرۂ آخرت بنے گا، لیکن اگر کم دی گئی تو اس کا سخت وبال ہوگا، زکوۃ ایک دینی فریضہ ہے، اس کی ادائیگی کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک اہم فرض سے سبکدوش رہے ہیں، اس لیے زکوۃ دیتے وقت یہ سوچنا کہ وہ کوئی بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں یا زکوۃ دے کر مستحقین پر احسان کر رہے ہیں انتہائی

غلط ہے، قرآن کریم میں اس کی سخت مذمت وارد ہے، اللہ نے اگر آپ کو مال دیا ہے اور صاحب نصاب بنایا ہے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور اس کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اس مال کی زکوۃ وقت پر نکالیں اور زکوۃ کی تمام شرائط و آداب کی رعایت ملحوظ رکھیں۔

کن چیزوں میں زکوۃ نہیں ہے:

(۱) رہائشی گھر (۲) استعمال کے کپڑے (لباس، چادریں، فرش وغیرہ) (۳) گھریلو سامان فرنیچر، فریج، واشنگ مشینیں، کولر، اوون، گیس کا چولہا سلنڈر وغیرہ (۴) کار، موٹر سائیکل وغیرہ (۵) حفاظتی ہتھیار (۶) کھانے پینے کا سامان (۷) سجاوٹ کی چیزیں (گلدان، گملے، پھول، منقش برتن وغیرہ) بہ شرط یہ کہ سونے چاندی کے نہ ہوں۔ (۸) ہیرے، جواہرات (۹) علمی کتابیں جو مطالعے کی ہوں (۱۰) آلات زراعت وتجارت وصنعت وحرفت، کارخانوں میں لگی ہوئی مشینیں، کرایہ پر چلنے والی بسیں، کاریں، ٹیکسیاں، ٹرک وغیرہ (فتاوی عالمگیری: ۱/۱۷۲) (۱۱) گروی رکھی ہوئی چیزیں، نہ رہن رکھنے والے پر زکوۃ ہے نہ اس شخص پر جس کے پاس بہ طور رہن رکھی ہوئی ہیں، رہن سے چھڑانے کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی (فتاوی شامی: ۳/۱۷۱) (۱۲) عورت جب تک اپنے دین مہر پر قابض نہ ہو جائے اس پر زکوۃ نہیں ہے (فتاوی عالمگیری: ۱/۱۷۲) جس قرض کی وصولیابی کی قطعاً امید نہ ہو اور مقروض نے دینے سے انکار کر دیا ہو اس پر بھی زکوۃ نہیں ہے، اگر ناامیدی کے بعد کسی وجہ سے رقم وصول ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی، رقم پر ایک سال گزر جائے تب زکوۃ واجب ہوگی (فتاوی شامی: ۳/۱۷۱، احسن الفتاوی: ۴/۲۶۶)

قرض میں دی ہوئی رقم پر زکوۃ:

قرض میں دی ہوئی رقم پر اگر وہ نصاب کے مطابق ہے زکوۃ ہوگی اور یہ زکوۃ قرض دینے والے کے ذمے ہوگی، اب یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ وصول یابی کے بعد

گذشتہ تمام سالوں کی زکوۃ ادا کر دے، یا ہر سال دی ہوئی رقم کا حساب لگا کر ادا کرتا رہے۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/۸۵، کفایۃ المنتہی: ۴/۲۵۱) اگر قرض میں رقم دے رکھی ہے اور بہ ظاہر اس کے ملنے کی امید نہیں ہے تو جب تک وصول نہ ہو اس وقت تک زکوۃ واجب نہیں ہے لیکن قرض کی رقم وصول ہو جانے کے بعد گذشتہ تمام سالوں کی زکوۃ بھی ادا کرنی ہوگی۔ (فتاوی دار العلوم: ۶/۹۷) مقروض کو قرض معاف کرنے سے زکوۃ ادا نہیں ہوتی، اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ پہلے مقروض کو اتنی رقم جو آپ معاف کرنا چاہتے ہیں دے کر اسے مالک بنا دیا جائے پھر وہ اس رقم کو قرض کی مد میں ادا کر دے اس صورت میں زکوۃ بھی ادا ہو جائے گی اور قرض بھی وصول ہو جائے گا

(فتاوی دار العلوم: ۶/۸۹، فتاوی رحیمیہ)

نصاب زکوۃ میں کمی بیشی:

شروع سال میں نصاب پورا ہو اور سال کے آخر میں بھی پورا ہو تو درمیان سال کی کمی بیشی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، خواہ مال کم رہ جائے یا اس میں اضافہ ہو جائے جس دن زکوۃ کی ادائیگی کے لیے حولان حول یعنی سال گزرنے کی شرط پوری ہوگی اس دن کا نصاب دیکھا جائے گا کہ پورا ہے یا نہیں اگر پورا ہے تو زکوۃ واجب ہے، کم ہے تو زکوۃ واجب نہیں ہے (بدائع الصنائع: ۲/۹۹)

زکوۃ کے لیے نیت ضروری ہے:

زکوۃ ادا کرنے کے لیے نیت ضروری ہے، کسی غریب کو بہ راہ راست زکوۃ دیتے وقت، یا زکوۃ دینے کے لیے کسی وکیل کو رقم دیتے ہوئے یا مال میں سے زکوۃ میں دی جانے والی رقم الگ کرتے ہوئے زکوۃ کی نیت کر لینی چاہئے، اگر کسی شخص نے نیت نہیں کی اور زکوۃ کی رقم مستحق کے پاس پہنچ گئی اس کے بعد نیت کا خیال آیا تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ رقم مستحق کے پاس موجود ہے یا خرچ ہو گئی، اگر موجود ہے تو زکوۃ ادا

ہوجائے گی اور اگر فقیر کے پاس سے خرچ ہوگئی یا ضائع ہوگئی تو زکوۃ ادا نہیں ہوگی۔ (فتاوی شامی: ۳/۴/۱۷۱، فتاوی دار العلوم: ۶/۷۹) البتہ اگر کسی نے پورا نصاب ہی خیرات کردیا اور نیت نہیں کی تو اس کے ذمے سے استحساناً زکوۃ ساقط ہوجائے گی
(فتاوی عالمگیری: ۱/۱۷۱)

مرنے والے کی زکوۃ:

اگر کوئی شخص صاحب نصاب زکوۃ کی وصیت کیے بغیر مر گیا تو اس کے مال کی زکوۃ نہیں لی جائے گی، ہاں اگر مرنے والا شخص وصیت کر کے مرا ہو تو اس کے تہائی مال میں سے زکوۃ ادا کی جائے گی، خواہ وہ تہائی مال زکوۃ کی مد میں پورا ہوجائے یا کم رہے اس سے زائد مال زکوۃ میں خرچ نہیں کیا جائے گا اور باقی مال ورثاء میں تقسیم کردیا جائے گا، اگر ورثا خوشی سے بقیہ مال میں سے ادا کرنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں ہے
(احسن الفتاوی: ۴/۲۶۵، فتاوی دار العلوم: ۶/۳۳۰)

زکوۃ کے لیے شوہر کی اجازت ضروری نہیں ہے:

اگر کسی عورت کے پاس نصاب کے برابر زیورات ہوں یا نقد روپیہ ہو تو اس پر زکوۃ ہے کیوں کہ وہ زیورات کی مالک ہے، اس کے لیے شوہر کی اجازت یا مرضی ضروری نہیں ہے، اسے یہ زکوۃ اپنے پاس سے ادا کرنی چاہیے، اگر دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں تو زیور بیچے، زکوۃ ضرور ادا کرے، ہاں اگر شوہر بیوی کی طرف سے دے دے، یا بیوی اپنے شوہر سے لے کر دے دے تو زکوۃ ادا ہوجائے گی۔
(فتاوی دار العلوم: ۶/۱۲۱)

مال حرام کی زکوۃ:

حرام مال میں زکوۃ واجب نہیں ہوگی، اگر مال حرام کا مالک معلوم ہے تو جس کا مال ہے اس کو واپس کرنا ضروری ہے اور اگر معلوم نہیں ہے تو تمام مال صدقہ کردینا

ضروری ہے، اگر کسی کے پاس حلال وحرام مال ملا جلا ہے تو اس میں سے حرام مال الگ کرکے دیکھا جائے گا کہ بہ قدر نصاب باقی رہتا ہے یا نہیں اگر باقی رہتا ہے تو باقی ماندہ مال پر زکوۃ دی جائے گی (احسن الفتاوی: ۴/۲۸۳، فتاوی دار العلوم: ۶/۴۹ امداد الفتاوی: ۲/۲۳)

رمضان میں زکوۃ ادا کرنے کا ثواب:

یوں تو سال کے کسی بھی مہینے اور کسی بھی دن زکوۃ نکالی جاسکتی ہے، لیکن رمضان میں عبادت کا اجر وثواب زیادہ ہے اس لیے اگر اس ماہ مبارک میں زکوۃ نکالی جائے تو اللہ تعالی حسب وعدہ انشاء اللہ ستر گنا ثواب عنایت فرمائیں گے۔ (صحیح ابن خزیمہ: ۳/۱۹۱، رقم الحدیث: ۱۸۸۷، بیہقی فی شعب الایمان: ۳/۳۰۵، رقم الحدیث: ۳۶۰۸)

صدقۂ فطر کیا ہے؟

اللہ تعالی کی توفیق سے رمضان المبارک کے روزے بہ خیر وخوبی پورے ہوئے، ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی طاقت اور صحت سے رمضان کے روزے پورے کرسکا، اور اس ماہ کی جو دوسری عبادتیں تھیں ان کی ادائیگی سے بھی فارغ ہوا، مسرت کے ان لمحات کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے خدا کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا جائے، عید الفطر کی یہ دوگانہ نماز دراصل اسی جذبۂ تشکر کا اظہار ہے، رمضان میں ہم نے جو عبادتیں کی ہیں اور ہم ان عبادتوں کی بجا آوری پر جو سجدۂ شکر ادا کررہے ہیں وہ سب بارگاہ خداوندی میں قبولیت سے سرفراز ہوں اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی رضا جوئی کے لیے کچھ اور نیک کام بھی کریں، تاکہ وہ خوش ہوکر ہماری رمضان کی محنت بھی قبول فرمالے اور ہماری یہ دوگانہ نماز بھی جو ہم عید کے دن ادا کرنے والے ہیں، اللہ کی رضا کا سب سے بہترین ذریعہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے، ہم عید الفطر منانے والے ہیں، یہ خوشی

کا دن ہے، لیکن ہمیں اپنی خوشی میں اس طرح مست نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے غریب رشتہ داروں اور غریب پڑوسیوں کو بھول جائیں، ہمیں چاہئے کہ ہم انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک کریں، اوران کو عید کی خوشیوں میں شامل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ان کی مالی مدد کی جائے تاکہ وہ بھی اپنے لیے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اچھے لباس اور اچھے کھانے کا نظم کرسکیں، صدقۃ الفطر صاحب حیثیت مسلمانوں پر اسی لیے واجب قرار دیا گیا ہے تاکہ غرباء بھی عید کی حقیقی خوشی سے محروم نہ رہیں حدیث شریف میں صدقۃ الفطر کے مقصد، مصلحت اور حکمت پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے، کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۃ الفطر اس لیے واجب فرمایا ہے تاکہ اس سے روزوں میں ہونے والی لغویات اور گناہوں کا کفارہ ہوجائے اور وہ مساکین کے رزق کا ذریعہ بھی بن جائے (ابوداؤد:۱/۵۰۵، رقم الحدیث:۱۶۰۹) بہ ہرحال صدقۃ الفطر رمضان کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے اور غرباء ومساکین کے تعاون کا ذریعہ بھی، اس لیے جن لوگوں پر صدقۃ الفطر واجب ہو ان کو چاہئے کہ وہ احساس ذمہ داری کے ساتھ بروقت یہ واجب ادا کریں۔

صدقۃ الفطر کا وجوب:

صدقۃ الفطر واجب ہے، متعدد روایات سے اس کا وجوب ثابت ہوتا ہے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر مسلمانوں پر واجب قرار دیا ہے وہ غلام ہو یا آزاد، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا (بخاری :۲/۵۴۷، رقم الحدیث: ۱۴۳۳، مسلم:۲/۶۷۷، رقم الحدیث: ۹۸۴) حضرت ابوسعید خدریؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم صدقۂ فطر نکالا کرتے تھے (بخاری: ۲/۵۴۸، رقم الحدیث:۱۴۳۵، مسلم:۲/۶۷۸، رقم الحدیث:۹۸۵) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آخر میں ارشاد فرمایا،

اخرجوا صدقة صومكم (ابوداؤد: ۱/۵۰۹، رقم الحديث: ۱۶۲۲) ''اپنے روزے کا صدقہ نکالو'' ایک روایت یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے کی گلیوں میں منادی بھیج کر یہ اعلان کرایا کہ صدقۂ فطر ہر مسلمان مرد، عورت، آزاد، غلام چھوٹے بڑے پر واجب ہے (ترمذی:۳/۶۰، رقم الحدیث:۶۷۴) ایک روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقۂ فطر نکالنے کی ہدایت کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ (صدقۂ فطر سے) تمہارے امراء کا تزکیۂ نفس ہوگا اور تمہارے فقراء کو اس سے زیادہ کر کے واپس جائے گا۔ (ابوداؤد:۱/۵۰۸، رقم الحدیث:۱۶۱۹)

صدقۂ فطر کس پر واجب ہے؟

صدقۂ فطر ہر اس مسلمان مرد وعورت پر واجب ہے جو عید الفطر کے دن ساڑھے باون تولہ چاندی یا ساڑھے سات تولہ سونا یا ان کے بہ قدر زیور، نقد یا بنیادی ضروریات یعنی رہائشی مکان، استعمال کے کپڑے اور برتن وغیرہ سے زیادہ سامان کے مالک ہوں، مثلاً قیمتی کپڑے، برتن فرنیچر وغیرہ، جن کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی (چھ سو بارہ گرام چاندی) کے برابر ہوجاتی ہو، یا دکان میں اتنی ہی قیمت کا سامان ہو، بنیادی ضروریات سے زیادہ کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ جس کے پاس رہائشی مکان، سامان خورد ونوش اور استعمالی کپڑوں کے علاوہ کرائے کے مکانات، زمین غیر ضروری کپڑے سال بھر سے زائد ضرورت کی اجناس اتنی مقدار میں ہوں کہ ان کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہوجائے، اس مال پر سال کا گزرنا شرط نہیں، نہ مال کا تجارتی ہونا شرط ہے، (علم الفقہ، ص:۵۱۶) زکوۃ اور صدقۃ الفطر کے فرق کو سمجھ لینا چاہئے، زکوۃ سونا، چاندی، روپے، مال تجارت پر واجب ہوتی ہے بہ شرطیکہ سال گزر جائے، جب کہ صدقۂ فطر کے وجوب کے لیے یہ ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کسی کے پاس حوائج اصلیہ سے زائد سامان بہ قدر نصاب زکوۃ عید کے روز

موجود ہو تو اس پر صدقۂ فطر واجب ہوگا (فتاوی شامی: ۲۸۲/۳)

صدقۂ فطر کس کی طرف سے دیا جائے:

جس شخص پر صدقۂ فطر واجب ہے اس کو اپنی طرف سے ادا کرنا چاہئے، اپنی نابالغ اولاد اور خادم و نوکر کی طرف سے بھی ادا کرنا چاہئے، بالغ اولاد اگر تنگ دست اور محتاج ہوں تو ان کی طرف سے بھی ادا کرنا چاہئے، مگر یہ لازمی نہیں ہے ادا کر دے تو بہتر ہے، البتہ اگر وہ مال دار ہیں تب خود ادا کریں، نابالغ اولاد اگر مال دار ہو تو اس کے مال میں سے ادا کیا جائے گا، لیکن اگر باپ نے نابالغ مال دار اولاد کی طرف سے ادا کر دیا تو ادا ہو جائے گا، بیوی اگر مال دار ہے تو وہ اپنا صدقۂ فطر خود ادا کرے تاہم اگر اس کی طرف سے شوہر نے ادا کر دیا تو ہو جائے گا، اگر کسی نے کسی عذر (سفر بیماری یا بڑھاپے) کی وجہ سے یا بلا عذر روزے نہیں رکھے تب بھی صدقۂ فطر واجب ہے اولاد کے ذمے والدین کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا ضروری نہیں ہے، اگرچہ وہ اولاد کی کفالت ہی میں کیوں نہ ہوں، ہاں اگر اولاد ان کی طرف سے ادا کر دے تو ادا ہو جائے گا، یتیم پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی طرف سے صدقۂ فطر ادا کرنا نانا دادا پر واجب نہیں ہے، لیکن ادا کر دے تو زیادہ بہتر ہے، اگر بچے بالغ ہیں مگر کم عقل یا دیوانے ہیں تو ان کی طرف سے بھی ادا کرنا واجب ہے۔

(بدائع الصنائع: ۲۰۲/۲ فتاوی شامی: ۲۸۲/۳)

صدقۂ فطر کس وقت واجب ہوگا؟

جو شخص عید الفطر کی صبح صادق کے وقت موجود ہے اس پر صدقۂ فطر واجب ہے، اب اگر کوئی بچہ صبح صادق سے پہلے پہلے پیدا ہوا تو اس کی طرف سے ادا کرنا ضروری ہے، لیکن اگر وہ فجر کے بعد ہوا تو اس کی طرف سے ادا کرنا ضروری نہیں ہے اسی طرح اگر کوئی شخص صبح صادق سے پہلے پہلے مر جائے یا فقیر ہو جائے تو اس کی

طرف سے صدقۂ فطر ادا نہیں کیا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی کافر عید کی رات میں مسلمان ہو گیا اس پر صدقۂ فطر واجب ہے، لیکن عید کی صبح میں مسلمان ہوا تو اس پر واجب نہیں ہے (فتاوی عالمگیری: ۱۹۲/۱)

صدقۂ فطر کس وقت ادا کیا جائے:

صدقۂ فطر عید کی نماز سے پہلے دینا بہتر ہے، تاکہ جن غریب بھائیوں کو فطرے کی رقم یا سامان وغیرہ دیا جا رہا ہے وہ بھی عید کی خوشیوں میں شامل ہو جائیں بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ رمضان ہی میں ادا کر دیا جائے تاکہ غریب بھائی اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں، اگر رمضان المبارک میں ادا نہ کیا جا سکے تو عید کی نماز کے لیے جانے سے پہلے پہلے ادا کر دینا چاہئے، اس لیے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا تھا کہ صدقۂ فطر نماز کے لیے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری: ۵۴۷/۲، رقم الحدیث: ۱۴۳۲، مسلم: ۶۷۹/۲، رقم الحدیث: ۹۸۶) البتہ اگر کسی نے عید سے پہلے یا عید کی نماز کے لیے جانے سے پہلے ادا نہیں کیا تو اس کے ذمے سے ساقط نہیں ہوگا، بلکہ عید کے بعد ادا کرے تاہم اس صورت میں اجر کم ہوگا، رمضان سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنے میں اختلاف ہے احناف کے دونوں طرح کے قول منقول ہیں، اور راجح قول یہ ہے کہ صدقۂ فطر رمضان المبارک سے پہلے بھی ادا کیا جا سکتا ہے اور صاحب نصاب ہونے سے پہلے بھی دے سکتا ہے، (فتاوی عالمگیری: ۱۹۲/۱)

صدقۂ فطر کی مقدار شرعی:

صدقۃ الفطر میں گیہوں، آٹا، ستو نصف صاع مقرر ہے، جو، چھوہارے، منقی ایک صاع ہے اگر کوئی چاول، چنا، باجرہ، مکئی، مٹر، مسور، ارہر اور دوسرے غلے دینا چاہے تو وہ نصف صاع کے حساب سے دے سکتا ہے، غلہ نہ دینا چاہے تو نقد رقم بھی

دے سکتا ہے، اس صورت میں نصف صاع گیہوں کی رقم بازار کے بھاؤ کے اعتبار سے ادا کردی جائے، کنٹرول ریٹ کا اعتبار نہیں ہے، نصف صاع موجودہ وزن کے اعتبار سے ایک کلو پانچ سو چوہتر گرام چھ سو چالیس ملی گرام ہے (۱۵۷۴٫۶۴۰)

(الاوزان المحمودہ، ص:۱۰۵، فتاوی رحیمیہ :۳/۱۱۳)

صدقۂ فطر کس کو دیا جائے؟

صدقۂ فطر کے مستحقین بھی وہی ہیں جو زکوۃ اور عشر کے ہیں، ان کے سوا کسی اور کو صدقۂ فطر دینا جائز نہیں ہے، البتہ زکوۃ کی وصول یابی پر متعین شخص کو صدقۂ فطر نہیں دیا جا سکتا، کئی افراد کا صدقۂ فطر ایک محتاج کو بھی دیا جا سکتا ہے، مگر کسی ایک شخص کو اتنی رقم دینا پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ صاحب نصاب ہو جائے۔ (علم الفقہ :۵۱۹)

عید کو عید کیوں کہتے ہیں:

شوال کے مہینے کی پہلی تاریخ کو عید الفطر کہتے ہیں، یہ لفظ ''عود'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹنا، مفردات القرآن کے مصنف امام راغب الاصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ عید وہ ہے جو بار بار عود کرے یعنی لوٹ کر آئے، عربوں نے اس لفظ کو خوشی اور مسرت کے دن کے لیے مخصوص کر لیا ہے، قرآن کریم میں اس معنی میں یہ لفظ حضرت عیسی علیہ السلام کی اس دُعا میں استعمال کیا گیا ہے اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِنَ السَّمَاءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْداً لِاَوَّلِنَا وَآخِرِنَا (المائدۃ: ۱۱۴) ''اے اللہ ہم پر آسمان سے ایک دستر خوان نازل فرما دیجئے جو ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے لیے باعث مسرت ہو'' شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے لیے خاص ہے، اللہ نے یہ چار دن خوشی اور مسرت کے قرار دیئے ہیں اور انہیں حدیث شریف میں ایام اکل وشرب (کھانے پینے کے دن) کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے رمضان کا بابرکت مہینہ ختم ہو رہا ہے، اور اب عید الفطر کی آمد کا شور ہے، اللہ کے نیک

بندوں نے حسب توفیق اس مہینے کی برکتیں سمیٹ لی ہیں، روزے، تراویح، اعتکاف اور تلاوت کلام پاک جیسی عبادتوں سے اپنے نامۂ اعمال کا بوجھ بڑھا لیا ہے، عید ان نیک بندوں کے لیے انعام کا دن ہے، ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب عید الفطر کا دن ہوتا ہے تو فرشتے راستوں کے کناروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور پکار پکار کر کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! صبح سویرے اپنے رب کریم کی طرف چلو جو تم پر خیر و برکت کے عظیم احسانات فرمائیں گے اور تمہیں لامحدود اور لازوال ثواب عطا کریں گے، تمہیں رات کے قیام کا حکم دیا گیا تم نے قیام کیا اور تراویح پڑھی، تمہیں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا تم نے روزہ رکھا اپنے رب کا حکم مانا اور اطاعت کی، لہذا تم اپنے انعامات حاصل کرو، جب بندے عید کی نماز سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ایک فرشتہ اعلان کرتا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ نے تمہاری مغفرت کردی ہے، اب تم اپنے گھروں کو ہدایت یاب ہو کر جاؤ، آج انعام کا دن ہے اور اس دن کا نام آسمان میں یوم الجائزہ (انعام کا دن) رکھا جاتا ہے (مجمع الزوائد: ۳/رقم الحدیث: ۳۲۲۵، المعجم الکبیر: ۱/۲۲۶، رقم الحدیث: ۶۱۷) اس حدیث کو ایک دوسری حدیث کی روشنی میں دیکھئے فرمایا: كُلُّ عمل ابن آدم يضاعفُ الحسنة عشرة امثالها إلى سبع مائة ضعف قال الله عزوجل: إلا الصوم فإنه لي وانا أجزى به. (مسلم : ۲/۸۰۶، رقم الحديث: ۱۱۵۱) ''آدمی کے ہر عمل کا ثواب دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھا دیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ (کے ثواب کی نوعیت یہ نہیں ہے) روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا'' ہر نیکی کا اجر اللہ ہی عطا کرنے والا ہے مگر روزے کو بہ طور خاص اپنے لیے مخصوص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اجر بہت ہی خاص ہے، اب اگر عید کے دن ملنے والے انعامات کو اس حدیث کی روشنی میں دیکھیں تو جو کچھ روزہ داروں کو اس روز

بہ طور انعام ملنے والا ہے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس اجر کو کسی خاص عدد تک محدود کیا جا سکتا ہے۔

عید کا آغاز کب ہوا:

ہر قوم کے کچھ خاص دن ہوتے ہیں جن میں اس قوم کے لوگ اپنے اپنے عقیدے اور رسم و رواج کے مطابق جشن مناتے ہیں، اچھا لباس پہنتے ہیں، اچھا کھانا کھاتے ہیں اور مل جل کر خوشی کا کچھ وقت گزارتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ دیکھا کہ مدینے کے لوگ دو تہوار مناتے ہیں اور ان دونوں میں کھیل تماشے کیا کرتے ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا کہ یہ دو دن کیسے ہیں، کہنے لگے کہ ہم جاہلیت کے زمانے میں ان دو دنوں کو کھیل کود کے دن کے طور پر منایا کرتے تھے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ نے تمہارے ان دو تہواروں کے بدلے میں ان سے بہتر دو دن تمہارے لیے مقرر کر دیئے ہیں (ایک) عید الاضحیٰ کا اور (دوسرا) عید الفطر کا دن (ابوداؤد: ۱/۳۶۴، رقم الحدیث: ۱۱۳۴) اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اسلام انسانی فطرت کے تقاضوں کی نفی نہیں کرتا بلکہ وہ ان کی تکمیل کرتا ہے، خوشی اور مسرت کا اظہار انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اس مقصد کے لیے دور جاہلیت میں اہل مدینہ دو دن خاص رکھتے تھے، اسلام نے ان دو دنوں کو اظہار مسرت کے دن کے ساتھ ساتھ عبادت کا رنگ بھی دے دیا، دونوں دنوں میں مسلمان عیدگاہ جاتے ہیں اور دوگانہ نماز ادا کرتے ہیں، یہ دونوں تہوار اسلام کے توحیدی مزاج اور اس کی صاف ستھری تعلیمات کے عین مطابق ہیں، کیوں کہ عید الفطر مسلمانوں کا قومی و ملی تہوار بھی ہے اور عبادت بھی ہے، اسی لیے فقہاء نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی روشنی میں ان کے احکام بھی مرتب کر کے امت کے سامنے رکھ دیئے ہیں، عید تو ہم

منائیں گے ہی اگر اس دن کو شریعت کے حکم کے مطابق اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کی روشنی میں منائیں تو یہ ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا اس طرح ہم اس دن کے ہر لمحے کو عبادت بھی بنا سکتے ہیں اور دنیاوی لطف و مسرت کے ساتھ اخروی اجر و ثواب کے بھی مستحق ہو سکتے ہیں۔

عید کس طرح منائیں:

اسلام خشک مذہب نہیں ہے، نہ وہ جسمانی اور ذہنی تفریحات کے خلاف ہے بلکہ آپ جائز حدود میں رہ کر ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس سے آپ کے قلب و روح کو بھی تسکین ملے اور جسم کو بھی طمانینت کا احساس ہو، عید الفطر کا دن ہماری زندگی میں ایک سال میں ایک بار آتا ہے، آپ شریعت کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے اس دن کو یادگار بنا سکتے ہیں، خوشی اور مسرت کا پورا پورا مظاہرہ کریں، اچھا پہنیں، اچھا کھائیں تفریحی مشاغل اختیار کریں، عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے ملیں جلیں، اس دن روزہ رکھنے سے اسی لیے منع کیا گیا ہے کہ بہ قدر وسعت و صحت خوب کھایا پیا جائے، اگر آج کے دن بھی روزہ رکھنے کا حکم ہوتا تو عید کی خوشی آدھی رہ جاتی، بغیر کھائے پیئے کسی تفریح کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ اس دن نہائیں، دھوئیں، جو کپڑے سب سے اچھے ہوں وہ پہنیں، خوشبو لگائیں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ عید کے دن ہمارے گھر کچھ بچیاں بیٹھی تھیں اور جنگ بعاث سے متعلق کچھ اشعار گا رہی تھیں اسی دوران حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اللہ کے رسول کے گھر میں یہ کیا گایا جا رہا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس وقت ہماری طرف سے کروٹ لئے لیٹے ہوئے تھے (حضرت ابوبکرؓ کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا) اے ابوبکر انہیں گانے دو، ہر قوم کے لیے تیوہار کا ایک دن ہوتا ہے آج ہماری عید کا دن ہے (بخاری: ۱/۳۲۴، رقم الحدیث: ۹۰۹، مسلم: ۲/۶۰۷

رقم الحدیث:۸۹۳) اسی طرح روایات میں ہے کہ عید کے دن کچھ حبشی بازی گر کرتب دکھلا رہے تھے، آپ نے خود بھی وہ کرتب دیکھے اور حضرت عائشہؓ کو بھی اپنی آڑ میں کھڑا کر کے دکھلائے، جب حضرت عائشہؓ یہ تماشہ دیکھتے دیکھتے تھک گئیں تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اچھا اب چلو (مسلم:۲/۶۰۷، رقم الحدیث:۸۹۲)

آج ہم عید کو آزادی کا دن سمجھ کر ہر طرح کی خرافات میں مبتلا ہو جاتے ہیں، عید کے چاند کا اعلان ہوتے ہی واقعۃً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیطان کھل چکا ہے، جشن عید کے نام پر ہر وہ کام کیا جاتا ہے جس کی عام دنوں میں بھی اجازت نہیں ہے چہ جائیکہ وہ کام عید کی رات یا عید کے دن کیے جائیں۔

عید کی رات بڑی مبارک رات ہے:

یہ کوئی معمولی رات نہیں ہے، اگر چہ رمضان ختم ہو چکا ہے مگر یہ مہینہ بھی کچھ کم خیر و برکت کا نہیں ہے، یہ اس مہینے کی پہلی شب ہے، اس شب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسے لیلۃ العید (چاند رات یا عید کی رات) کہتے ہیں، حضرت ابو امامہؓ نے اس رات کے سلسلے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جس شخص نے عیدین کی راتوں میں خاص اجر و ثواب کی امید پر عبادت کی اس کا دل اس دن مردہ نہیں ہوگا جس دن لوگوں کے دل (آخرت کے خوف سے) مردہ ہو چکے ہوں گے (ابن ماجہ:۱/۵۶۷، رقم الحدیث:۱۷۸۲) اس کا مطلب یہ ہے کہ عیدین کی راتوں میں عبادت کرنے والے کا دل قیامت کے دن ہر طرح سے پر سکون ہوگا حالاں کہ وہ دن بڑا سخت ہوگا اور اس کی دہشت سے گنہ گاروں کے دل کانپ رہے ہوں گے، بعض علماء نے اس حدیث کی تشریح میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس شخص کا دل دنیا کی محبت میں دیوانہ نہ ہوگا اور یہ شخص بری موت سے محفوظ رہے گا، اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس رات کو عبادت میں گزارنا افضل ہے۔ (فتاوی محمودیہ:۲/۳۳۵، طبع قدیم)

عید الفطر کی سنتیں:

عید کی سنتیں یہ ہیں، ہمیں اس دن کا آغاز ان سنتوں پر عمل کرنے کے ساتھ کرنا چاہئے، اس طرح ہم عید کی خوشیاں بھی حاصل کریں گے اور سنت پر عمل کرنے کا ثواب بھی کمائیں گے، یہ کل تیرہ سنتیں ہیں، ان میں سے بہت سے کام تو ہم بڑے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں اگر ہم وہ کام کرتے ہوئے سنت کی نیت بھی کرلیں تو مفت میں سنت پر عمل کرنے کا ثواب بھی حاصل ہو جائے گا۔

(۱) شریعت کے مطابق اپنی آرائش کرنا (۲) غسل کرنا (۳) مسواک کرنا (۴) اپنے پاس جو کپڑے عمدہ سے عمدہ موجود ہوں چاہے وہ نئے ہوں یا دُھلے ہوئے ہوں پہننا (۵) صبح کو بہت سویرے اٹھنا (۶) خوشبو لگانا (۷) صبح سویرے عید گاہ پہنچ جانا (۸) عید گاہ جانے سے پہلے کوئی میٹھی چیز (مثلاً چھوہارے وغیرہ) کھانا (۹) عید گاہ جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنا (۱۰) عید کی نماز عید گاہ میں جا کر پڑھنا (۱۱) عید گاہ ایک راستے سے جانا اور دوسرے راستے سے واپس آنا (۱۲) پیدل جانا (۱۳) راستے میں آہستہ آواز سے تکبیر تشریق پڑھنا۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۱۴۹) تکبیر تشریق یہ ہے: اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ واللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْد۔ ان سنتوں کی وضاحت کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ مرد، عورت، بچے، جوان بوڑھے اپنا بہترین لباس زیب تن کریں، یہ ضروری نہیں ہے کہ لباس نیا ہو، مستعمل بھی ہو تو کوئی حرج نہیں ہے، لیکن دھلا ہوا صاف ستھرا ہونا چاہئے، ناخن وغیرہ تراش لئے جائیں، بال وغیرہ بنوا لئے جائیں اور غسل کر کے میل کچیل دور کر لیا جائے، اس روز اپنے آپ کو آراستہ کرنا چاہئے، خوشبو بھی لگا لینی چاہئے، نماز فجر پڑھ کر ہی عید گاہ چلے جانا بہتر ہے خواہ سورج ابھی نہ نکلا ہو، بعض لوگ نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے میں اتنی تاخیر کر دیتے ہیں کہ بھاگتے دوڑتے نماز میں شامل ہوتے ہیں، انہیں بالکل آخری صفوں میں جگہ ملتی ہے، بعض لوگ بلا عذر بھی

موٹر سائیکلوں اور کاروں وغیرہ پر سوار ہو کر عیدگاہ پہنچتے ہیں، یہ طریقہ خلاف سنت ہے عیدگاہ پیدل جانا چاہئے، ہاں اگر واپسی میں سوار ہو کر آئے تو کوئی مضائقہ نہیں، عیدگاہ جانے سے پہلے صدقۃ الفطر ادا کر دینا ضروری ہے، اگر چہ بعد میں بھی ادا ہو سکتا ہے، لیکن اس کا اجر اتنا نہیں ہوتا جتنا عید کی نماز سے پہلے ادا کرنے کا ہے، ملاقات کے وقت خندہ روئی اور بشاشت سے پیش آئے اور عید کی مبارک باد دے، عیدگاہ جانے سے پہلے کوئی نفل نماز نہیں ہے اور نہ عیدگاہ پہنچ کر کوئی نماز پڑھنی چاہئے، بلکہ خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر ذکر کرتا رہے، یا تلاوت میں مشغول رہے، فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ عید کے دن عورتیں بھی اپنے گھروں میں چاشت اور اشراق کی نمازیں اس وقت تک نہ پڑھیں جب تک عید کی نماز با جماعت ادا نہ ہو جائے (فتاوی شامی:۳/۴۸) عید کے دن عورتوں کے لیے بھی مستحب یہ ہے کہ وہ غسل کریں اور عمدہ لباس پہنیں کیوں کہ یہ خوشی اور زینت کا دن ہے۔

عید کے کچھ ضروری مسائل:

(۱) عید کا وقت طلوع آفتاب کے تقریبا پندرہ منٹ بعد شروع ہوتا ہے، اور زوال تک رہتا ہے، بہتر یہ ہے کہ نماز کا وقت پہلے سے متعین کر کے اعلان کر دیا جائے اور ایسا وقت متعین کیا جائے جو نہ اس قدر پہلے ہو کہ لوگوں کو تیار ہو کر عیدگاہ پہنچنا مشکل ہو جائے اور نہ اس قدر دیر میں ہو کہ عید کے دن کا زیادہ وقت نماز کے انتظار میں ہی گزر جائے (فتاوی شامی:۳/۴۹، فتاوی رحیمیہ:۶/۱۵۵)

(۲) عید کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا سنت مؤکدہ ہے، بلا عذر عیدگاہ نہ جانے والا لائق مذمت اور مستحق عتاب ہے، اور اگر کوئی شخص عیدگاہ جانے کے بجائے ہر سال بلا عذر شہر کی مسجد ہی میں نماز ادا کرے تو وہ گنہ گار ہوگا، عیدگاہ شہر سے باہر ہونی ضروری ہے، اگر کسی جگہ عیدگاہ نہ ہو تو شہر سے باہر کسی بڑے میدان میں نماز پڑھی جائے بڑے شہروں میں آبادی سے باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے ایسے شہروں میں بڑے بڑے میدانوں میں یا بڑی

مساجد میں دوگانہ نماز ادا کی جائے، بارش یا کسی دوسرے عذر کی وجہ سے مساجد میں نماز پڑھی جا سکتی ہے، ضعیفوں اور بیماروں کے لیے عیدگاہ نہ جانے کی اجازت ہے ایسے لوگوں کو مسجدوں میں عید کی نماز ادا کر لینی چاہئے۔ (فتاوی رحیمیہ،۶/۱۸۵احسن الفتاوی:۴/۱۱۹)

(۳) عورتوں کا عیدگاہ جانا صحیح نہیں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے گھر کی کوٹھری کی نماز کو مسجد نبوی کی نماز سے بدرجہا افضل بتلایا ہے اس میں عیدین کو الگ نہیں کیا گیا ہے، فتوی اسی پر ہے کہ تمام نمازوں میں عورتوں کا مسجد میں جانا ممنوع ہے، خواہ دن کی ہو یا رات کی، عورت جوان ہو یا ضعیفہ، یوں بھی عورتوں پر نماز عید واجب نہیں ہے، حرمین شریفین کا معاملہ بالکل الگ ہے، ان پر دوسری مساجد کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (فتاوی رحیمیہ:۶/۱۵۱، کفایۃ المفتی:۵/۴۲۱)

(۴) نماز عید کے لیے نیت اس طرح کی جائے کہ میں قبلہ رو ہو کر اس امام کے پیچھے دو رکعت واجب نماز ادا کر رہا ہوں اس میں چھ واجب تکبیریں زائد ہیں زبان سے یہ الفاظ ادا کرنا ضروری نہیں، محض دل میں نیت کر لینا بھی کافی ہے۔ (فتاوی دار العلوم:۵/۲۲۲،)

(۵) نماز عید کا طریقہ یہ ہے کہ نیت کے بعد تکبیر تحریمہ (اللہ اکبر) کہہ کر ہاتھ باندھ لیں، پھر ثنا پڑھیں، اس کے بعد دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائیں اور تین مرتبہ تکبیر کہیں، پہلی اور دوسری مرتبہ کی تکبیر میں ہاتھ نیچے کی طرف چھوڑ دیئے جائیں گے اور چوتھی مرتبہ ہاتھ باندھ لئے جائیں گے، اس کے بعد قرأت، رکوع وسجدہ وغیرہ کر کے دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہو جائیں، دوسری رکعت میں فاتحہ اور سورت پہلے پڑھی جائے گی، پھر تین تکبیریں کہی جائیں گی اور ہر تکبیر پہ ہاتھ کانوں تک لے جا کر نیچے کی طرف چھوڑ دیئے جائیں گے، چوتھی تکبیر بغیر ہاتھ اٹھائے کہی جائے گی اور رکوع میں چلے جائیں گے۔ (فتاوی عالمگیری:۱/۱۵۰)

(۶) عید کا خطبہ دینا سنت مؤکدہ ہے، یہ خطبہ عید کی نماز کے بعد پڑھا جائے گا، عید کا خطبہ سننا اور خاموش رہنا واجب ہے خواہ اتنی دور بیٹھا ہوا ہو کہ آواز نہ آرہی ہو، اس وقت بات چیت کرنا ناجائز ہے اور شور مچانا سخت گناہ ہے۔ (درمختار: ۱/ ۵۸۵ فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۵۰، امداد المفتیین: ۱/ ۷۸)

(۷) عید کی نماز کے فوراً بعد عید کی نیت سے گلے ملنا اور مصافحہ کرنا مسنون نہیں ہے، تاہم ایک دوسرے کو عید کی مبارک باد دینا جائز ہے، یہ ممانعت خاص اس وقت ہے جب عید کی نماز ختم ہوئی ہو، لوگ اس وقت کھڑے ہو کر معانقہ ومصافحہ شروع کردیتے ہیں اور اسے عید کا لازمی حصہ سمجھتے ہیں، یہ بدعت ہے، البتہ عید کے دن گھر پر، یا راستے وغیرہ میں ملاقات پر معانقہ، مصافحہ کیا جاسکتا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے (احسن الفتاوی: ۴/ ۳۵۴، امداد الفتاوی: ۱/ ۷۰۸)

(۸) عید کی نماز کے بعد دعا مانگنا مستحب ہے، مگر خطبے کے بعد دعا نہیں مانگی جائے گی (فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۵۲)

(۹) اگر عید جمعہ کے روز واقع ہو تو دونوں نمازیں اپنے اپنے وقت پڑھی جائیں گی، عید کی نماز واجب ہے اور جمعہ کی نماز فرض ہے، دونوں کا چھوڑنا گناہ ہے۔ (فتاوی دار العلوم: ۵/ ۱۴۵)

(۱۱) عید کا دن خوشی کا ہوتا ہے، بسا اوقات خوشی میں آدمی آخرت سے غافل ہوجاتا ہے اور زیارت قبور سے آخرت یاد آتی ہے، اس لیے اگر کوئی شخص عید کے دن قبرستان جائے تو مناسب ہے کچھ مضائقہ نہیں، لیکن اگر اس کے التزام سے دوسروں کو شبہ ہو کہ یہ چیز لازمی اور ضروری ہے تو نہ جانا چاہیے یا کبھی کبھی ترک کردینا چاہیے یا مقدم مؤخر کردینا چاہیے، اگر کوئی شخص اس دن زیارت قبور نہ کرے تو اس پر طعن کرنا یا اسے حقیر سمجھنا درست نہیں ہے۔ (فتاوی محمودیہ: ۲/ ۲۷۷، طبع قدیم)

عید مبارک ہو

"عید مبارک ہو" یہ چھوٹا سا جملہ اپنے اندر معانی کی ایک پوری کائنات سموئے ہوئے ہے، اس میں ایک لفظ عید ہے جو لغت میں بھی، عرف میں بھی اور شریعت کی اصطلاح میں بھی خوشی اور مسرت کے دن کے لیے بولا جاتا ہے، اس لفظ کی اصل عود ہے، جس کے معنی ہیں لوٹنا، عربوں کی یہ عام عادت ہے کہ وہ مخصوص مواقع وحالات کے لیے ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں جن میں جذبات کا اظہار بھی ہو اور ان کے دوام واستمرار کی تمنا بھی، چناں چہ خوشی کے دن کے لیے عید کا لفظ وضع کیا گیا جس میں یہ دعا پوشیدہ ہے کہ یہ دن زندگی میں اسی طرح آتا رہے، مفردات القرآن کے مصنف امام راغب اصفہانیؒ نے لکھا ہے کہ عید وہ ہے جو بار بار عود کرے یعنی لوٹ کر آئے، شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ عید الفطر اور عید الاضحی کے لیے خاص ہے شرعی طور پر یہ چار دن خوشی اور مسرت کے قرار دیے گئے ہیں اور انہیں حدیث شریف میں ایام اکل وشرب (کھانے پینے کے دن) کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے، اس جملے کا دوسرا لفظ "مبارک" ہے، یہ بھی دعا ہے اور بڑی بامعنی اور مکمل دعا ہے، برکت کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز میں اللہ تعالی کی طرف سے خیر اور بھلائی عطا کردی جائے، عام طور پر اللہ کی عطا کردہ ان خوبیوں کا احساس بھی نہیں ہوتا، کیوں کہ وہ غیر محسوس طریقے پر عطا کردی جاتی ہیں اور نہ ان کے اطراف وجوانب کا احاطہ ہوسکتا ہے، کیوں کہ وہ

بے حد و بے حساب ہوتی ہیں اور بے شمار طریقوں سے نوازی جاتی ہیں، اسی لیے ہر اس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی کا مشاہدہ ہو مبارک اور بابرکت کہتے ہیں پھر اس لفظ میں ایک اور مفہوم بھی پوشیدہ ہے اور وہ ہے ٹھہراؤ اور جماؤ، یعنی وہ خوبی، بھلائی اور وہ خیر اس چیز میں دیر تک موجود رہے جس کو ہم مبارک کہہ رہے ہیں، اسی لیے اونٹ کے سینے کو بَرَک کہتے ہیں کیوں کہ وہ سینہ ٹیک کر اور جما کر بیٹھتا ہے، اور اسی طرح بیٹھا رہتا ہے، اور اسی لیے حوض وغیرہ کو جہاں پانی رک جائے اور جمع ہو جائے بِرکہ کہتے ہیں، اس طرح ہر وہ چیز، ہر وہ آدمی، ہر وہ جگہ، ہر وہ دن مبارک ہے جس میں اللہ کی طرف سے غیر محسوس طریقے سے خیر کا نزول ہو، اب اگر آپ کسی عزیز قریب، اجنبی یا متعارف شخص کے لیے یہ جملہ دل کی گہرائیوں کے ساتھ زبان سے ادا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ آپ اس کے لیے خوشی اور مسرت سے بھرپور ایک ایسے دن کی آرزو کر رہے ہیں جو اس کی زندگی میں ایک بار نہیں بار بار آئے اور اس میں خدا تعالیٰ کی عطا کردہ بے شمار نعمتیں اور برکتیں بھی جلوہ فگن ہوں۔

اس پُر مسرت، خوش گوار اور مبارک و مسعود دن کے وہ کون سے پہلو ہیں جن کی وجہ سے یہ دن مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ایک خاص اہمیت و معنویت رکھتا ہے؟ اور اس دن کے لیے شریعت کی وہ کونسی تعلیمات و ہدایات ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر اللہ کے نیک بندے اس دن کی سعادتوں اور برکتوں سے اپنا دامن مراد بھر سکتے ہیں؟ اس مضمون میں اسی طرح کے کچھ سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ماہ رمضان کے روزوں کی ادائیگی کے بعد اس مبارک دن کی صبح کو جسم کی نظافت، روح کی طہارت، ظاہر کی صفائی اور باطن کی پاکیزگی کے ساتھ تمام مسلمانوں کو اپنے دربار میں حاضری کی دعوت دی ہے، تاکہ وہ پورے ایمان و یقین کے ساتھ اللہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھائیں اور اپنا وہ انعام وصول کرلیں جس کا ان سے

...دہ کیا گیا تھا، اللہ نے رمضان کی مبارک ساعتوں میں انہیں توفیق دی تھی کہ وہ دن کو روزہ رکھیں اور رات کو قیام کریں، انہوں نے اللہ کی بخشی ہوئی توفیق سے اپنا تمام وقت روزہ، نماز اور ذکر و تلاوت میں گزارا اور خود کو ضبط نفس کا خوگر بنایا جب کہ نفس پر قابو پانا بڑا مشکل ہوتا ہے، اب وہ پورے استحقاق کے ساتھ حصول انعام کے لیے سر بسجود ہیں، اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا، یوں تو تمام عبادتیں ہی اللہ کے لیے ہیں، مومن کا تو جینا مرنا بھی اللہ کے لیے ہے روزے میں یقیناً کوئی خاص بات ہے جس کی وجہ سے اسے یہ امتیاز ملا ہے اور اللہ نے بطور خاص اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے، لائق مبارک باد ہیں وہ لوگ جو اس نسبت کے حوالے سے آج یہاں حاضر ہیں، اس سے بڑھ کر خوشی کا کوئی دوسرا لمحہ نہیں ہو سکتا جب خالق کائنات خود اپنی مخلوق کو اپنے خاص انعام سے نوازے گا۔

خوشی کے ان لمحات میں بھی بندہ اپنے آقا و مولی کے ذکر سے غافل نہیں ہے اور غافل ہونا بھی نہیں چاہئے کیوں کہ یہ لمحے اسی کی توفیق سے میسر ہوتے ہیں، اور وہی ہے جو ان لمحوں کی برکتوں سے مستفید ہونے کی توفیق عطا کرنے والا ہے، بھلا کون بد بخت ہوگا جو ان یادگار لمحوں میں اپنے سب سے بڑے محسن کو فراموش کرے گا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دل میں پروردگار کی کبریائی اور عظمت کا یقین سجا کر زبان کو تکبیر مسلسل سے تر بہ تر کرتا ہوا شکرانے کی دو رکعتیں ادا کرنے کے لیے عیدگاہ کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔

یہ تکبیر ہی عید کا شعار اور اس کی پہچان ہے، آج کے دن دنیا کا ہر خطہ اہل ایمان کی آوازوں سے گونج رہا ہے، سب کے ہونٹوں پر ایک ہی نعرہ ہے، سب کا یقین مشترک ہے سب کا مطمح نظر ایک ہے، سب کے دلوں میں رضائے الٰہی کا یکساں احساس موجزن ہے، اس تکبیر میں انکسار، خضوع، تسلیم و رضا کے تمام معانی

جلوہ گر نظر آتے ہیں، یہ شعار جسے ایمان والوں نے صبح صادق سے اپنا رکھا ہے قرآن کریم کی ہدایت کے عین مطابق ہے فرمایا: وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (البقرة: ۱۸۵) ”اور تا کہ تم لوگ شمار کی تکمیل کرلیا کرو اور تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کیا کرو اس پر کہ اس نے تم کو ہدایت بخشی“۔ صبح عید کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آج کے دن جو دعا مانگی جائے گی وہ قبول ہوگی، کیوں کہ حکم تکبیر کے بعد متصلا یہ فرمادیا گیا: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ. (البقرة: ۱۸۶) ”اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں میں منظور کرلیتا ہوں عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے سو ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو قبول کریں اور مجھ پر یقین رکھیں امید ہے وہ لوگ فلاح حاصل کرسکیں گے“۔

دونوں آیتوں کا یکے بعد دیگرے آنا خالی از حکمت نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا کرنے والوں کا یہ مؤمنانہ اور عاجزانہ حق بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو شرفِ قبولیت سے نوازے، کیوں کہ انہوں نے دستِ دعا دراز کرنے سے پہلے رمضان کا پورا مہینہ صیام وقیام میں گزارا ہے، انہوں نے اپنے اعضاء وجوارح کو معاصی کے ارتکاب سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے، اور آج بھی جب کہ انہیں پورے ماہ کی عبادتوں کا صلہ ملنے والا ہے انہوں نے تکبیر وتہلیل کرتے ہوئے، حمد وشکر کے ملے جلے جذبات کے ساتھ صبح عید کی اولین ساعتوں میں قدم رکھا ہے، عید کی خوشی میں انہوں نے اپنے ضرورت مند غریب بھائیوں کو فراموش نہیں کیا بلکہ عید گاہ کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ان کے ہاتھ فطرے کی ادائیگی کے لیے ان غریبوں

بے کسوں اور مجبوروں کی مدد کے لیے بڑھے ہیں تا کہ وہ بھی عید کا یہ دن بہتر طریقے سے گزار سکیں، ان کے تن پر بھی اُجلا لباس ہو اور وہ بھی بہترین غذاؤں سے لطف اندوز ہوسکیں، ان اعمال نے انہیں قبولیتِ دعا کا مستحق بنادیا ہے، امید ہی نہیں یقین ہے کہ جب وہ نیکیوں اور طاعتوں کے ہجوم میں اپنے ہاتھ دُعا کے لیے پھیلائیں گے ایمان سے لبریز دل، ذکر خداوندی سے معطر زبان اور پاکیزہ جذبات واحساسات کے ساتھ قادر مطلق سے اپنی ضرورتوں کا سوال کریں گے تو یہ ہاتھ خالی نہیں لوٹیں گے دعائے مستجاب کے لیے ایک عاجز ولاچار بندہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے۔

عید کی معنویت پر اس پہلو سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خاص مرحلے کے ساتھ مربوط کیا ہے اور وہ مرحلہ تھا رمضان میں سخت ترین عبادتوں سے فراغت کا، اس ارتباط کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام نے عید کے دن کو اللہ کی اطاعت وعبادت کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے کہ تنہا اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ رمضان جیسے مقدس مہینے کو بھی عام مہینوں کی طرح گزار دیتے ہیں انہیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ روزہ داروں کی طرح خوشیاں مناتے پھریں، عید رمضان کا خوب صورت تتمہ یا بہترین اختتام ہے، توحیدِ خالص پر مبنی اس دین کی یہی تو ایک خصوصیت ہے کہ جس نے اسے دوسرے ادیان سے ممتاز وجداگانہ بنا رکھا ہے، عید کا تصور دوسرے مذاہب میں بھی ہے، اسلام سے پہلے لوگ اپنے اپنے مذہب کے دائرے میں رہ کر عید منایا کرتے تھے، حدیث شریف میں ہے کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں دو تہوار منائے جاتے ہیں، جن میں سے ایک کا نام نیروز اور دوسرے کا نام مہرجان ہے، صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم ان تہواروں میں شرکت کرسکتے ہیں، آپ نے فرمایا: نہیں اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان

دونوں تہواروں کے بدلے ان سے بہتر دو دن عطا فرمائے ہیں ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: لکل قوم عید وھذا عیدنا (بخاری: ۱/۳۴۲) "ہر قوم کی عید ہوتی ہے یہ ہماری عید ہے"۔

عید کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ خالص دینی، روحانی ماحول کی دین ہے اور خالق کائنات کی بندگی اور اس کی وحدانیت کے اعتراف کا مظہر ہے، اس کا تعلق نہ کسی دنیوی واقعے سے ہے اور نہ وہ کسی خاص شخصیت کی پیدائش و وفات سے مربوط ہے اس کے برعکس دوسرے مذاہب کی عیدیں کسی نہ کسی دنیوی واقعے یا شخصیت سے متعلق نظر آتی ہیں، مثال کے طور پر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش کی یادگار کے طور پر کرسمس مناتے ہیں، یہودی عید فسح اس لیے مناتے ہیں کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات ملی تھی، ہندو بھائی راون پر رام کی فتح کے یادگار دن کو چراغاں کرتے ہیں اور اسے دیوالی کے نام سے یاد کرتے ہیں، پارسی موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے جشن نوروز مناتے ہیں، اسلام نے عیدین کی بنیاد نہ ماضی کے کسی واقعے پر رکھی اور نہ کسی شخصیت کی پیدائش کے دن کو یادگار دن قرار دے کر اسے عید کے طور پر منانے کا حکم دیا، اگر شخصیتیں اس طرح کے تہواروں کی بنیاد ہوتیں تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے بہتر دوسری کون سی شخصیت ہوتی جن کی پیدائش کے دن کو عید کا دن قرار دیا جاتا، کیوں کہ آپ فخر موجودات بھی ہیں اور رحمت کائنات بھی، اگر دنیا میں آپ کی تشریف آوری کا دن عید قرار نہ پاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا دن تو ضرور عید کے طور پر منایا جاتا کیوں کہ اسی دن گم راہ انسانیت کو راہ ہدایت پر لانے کے عظیم ترین کام کا آغاز ہوا، بدر کی جنگ میں دشمنان اسلام پر فتح عظیم یا مکہ مکرمہ میں فاتحانہ شان کے ساتھ واپسی کے واقعات بھی ایسے ہیں جن پر مسلمان رہتی دنیا تک فخر کر سکتے ہیں اور ان کے حوالے سے ہر سال خوشی کے

چند لمحے گزار سکتے ہیں۔

یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ واقعات واشخاص کی اس حد تک تقدیس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ عبادت بن جائے، بلکہ وہ اللہ کی وحدانیت ہی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، صرف اللہ ہی ہے جو لائق عبادت ہے اور جس کی ذات تعظیم وتقدیس کے مراتب کمال کی مستحق ہے، اس لیے مومن کے افکار، جذبات اس کی زندگی اس کی عبادت سب کچھ اسی دائرۂ توحید میں ہی محصور رہنی چاہئے، قرآن کریم میں اس حقیقت کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (سورۃ الانعام: ۱۶۲-۱۶۳) "آپ فرمادیجئے کہ میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہان کا رب ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں"۔

حقیقی معنی میں مؤمن کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جس کا ہر کام آخرت کے اجر وثواب کی نیت سے محض اللہ کی مرضی کے تابع ہو، نماز پڑھے تو اللہ کے لیے پڑھے، زکوۃ ادا کرے تو اللہ کے لیے ادا کرے، حج کرے تو اللہ کے لیے کرے، روزہ رکھے تو اللہ کے لیے رکھے، عید کرے تو اللہ کے لیے کرے، اللہ اس کے ہر ہر عمل کا نگراں ہے حتی کے اُس چھوٹے سے قدم کا بھی اس کے یہاں اندراج ہے جو وہ اللہ کے راستے میں اٹھاتا ہے، اور اس ایک لفظ کا بھی جو وہ اللہ کے لیے زبان سے ادا کرتا ہے، اسے یہ یقین ہونا چاہئے کہ اس کا کوئی عمل ضائع نہیں جا رہا ہے بلکہ اخروی زندگی کے لیے ذخیرہ بن رہا ہے، قرآن کریم میں ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ لَایُصِیْبُھُمْ ظَمَاٌ وَّ لَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَۃٌ فِیْ سَبِیْلِ

اللّٰہِ وَلَا یَطَئُوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْکُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا کُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ، وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً وَّلَا کَبِیْرَةً وَّلَا یَقْطَعُوْنَ وَادِیًا اِلَّا کُتِبَ لَهُمْ لِیَجْزِیَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. (التوبة: ۱۲۰-۱۲۱) ''یہ اس سبب سے ہے کہ ان کو اللہ کی راہ میں جو پیاس لگی اور جو پریشانی ہوئی اور جو بھوک لگی اور جو قدم انہوں نے اٹھائے جو کفار کے لیے موجب غیظ ہوئے اور انہوں نے دشمنوں کی جو کچھ خبر لی ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا، یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے اور جو کچھ چھوٹا بڑا انہوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان ان کو طے کرنے پڑے یہ سب بھی ان کے نام لکھا گیا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے''۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہماری عید بھی فکر آخرت کے ساتھ متصف ہونی چاہئے، اس موقع پر ہماری تفریحات، ہماری خوشیاں، ہماری دعوتیں، ہماری ملاقاتیں سب میں ان حدود وقیود کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے جو کتاب وسنت نے ہم پر عائد کی ہیں، اگر چہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ دن خشک اور بے مزہ گزارا جائے بلکہ ہمیں شریعت کے دائرے میں رہ کر دنیوی نعمتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کھلی چھوٹ حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ: ۱۱) ''اور اپنے رب کی نعمتوں کا تذکرہ کرتے رہا کیجئے'' مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں ذکر نعمت سے مراد قولی ذکر بھی ہے اور عملی بھی ہے دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ واضح حکم موجود ہے: وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا (القصص: ۷۷) ''اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش مت کر''۔

حدیث شریف میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت ہمارے پاس دو چھوٹی لڑکیاں کچھ (اشعار وغیرہ) گا رہی تھیں، آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا اور بستر پر جا کر آرام فرمانے لگے اور دوسری طرف رخ کر لیا، پھر حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے اور مجھے ڈانٹا کہ کیا رسول اللہ کے گھر میں شیطانی کام ہو رہا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوبکر! انہیں کچھ نہ کہو ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے یہ ہماری عید ہے (بخاری: ۱/۳۲۴، رقم الحدیث: ۹۰۹، مسلم: ۲/۶۰۷، رقم الحدیث: ۸۹۲) حضرت عائشہؓ سے یہ بھی مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن انہیں زنگیوں کی نیزہ بازی کا کرتب بھی دکھایا۔ (مسلم: ۲/۶۰۷، رقم الحدیث: ۸۹۲) اس طرح کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ جائز حدود میں رہ کر تفریحات کے ذریعے تھکے ہوئے دل ودماغ اور جسم وروح کو آرام دینے کی اجازت ہے، لیکن عید کے نام پر اس کی اجازت نہیں کہ اس دن کو آزادی کا پروانہ تصور کر لیا جائے اور وہ سب کام انجام دیئے جائیں جن کی مذہب تو کیا مہذب سماج بھی اجازت نہیں دیتا، اس دن یہ اجازت ہے کہ اچھے کپڑے پہنے جائیں، جائز حدود میں رہ کر زیب وزینت اختیار کی جائے، لیکن غیر ضروری مظاہر تفاخر کی اجازت نہیں، آپ اپنے دسترخوان کو طرح طرح کے لذائذ اور انواع واقسام کے کھانوں سے سجا سکتے ہیں لیکن صرف ان کھانوں سے جن کی اجازت ہے، باقی دنوں کی طرح آج کے دن بھی اکلِ حرام کی کوئی گنجائش نہیں ہے کھیل کود کی اجازت ہے لیکن رقص وسرود کی اجازت نہیں ہے، افسوس دوسری قوموں کی طرح ہماری عید بھی بے راہ روی کا شکار ہوتی جا رہی ہے، اور دوسری قوموں کے نوجوانوں کی طرح ہمارے نوجوان بھی فحاشی اور بے حیائی کا کھلے عام مظاہرہ کرنے لگے ہیں ہمارے نوجوانوں کو یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ عید محض دنیوی تہوار نہیں ہے جس میں ہر طرح کی خرافات کی جا سکتی ہیں بلکہ یہ ہمارا دینی تہوار ہے

اسے ہم شریعت کی عائد کردہ شرائط کے ساتھ ہی منا سکتے ہیں، اس سلسلے میں والدین کی بڑی ذمہ داری ہے، ان کو چاہئے کہ وہ شروع ہی سے اپنے بچوں کے دلوں میں شعائر اسلام کی عظمت پیدا کرنے کی کوشش کریں اور انہیں بتلائیں کہ کسی خاص موقع ومناسبت کو شریعت کی ہدایات کے مطابق کس طرح گزارا جاسکتا ہے، اولاد کی لایعنی اور لغو سرگرمیوں پر والدین کی مجرمانہ خاموشی سے معاشرے میں فسق وفجور عام ہوتا جا رہا ہے، بے حیائی پھیل رہی ہے، پورا معاشرہ گم راہی کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے ان حالات میں ضرورت ہے کہ نئی نسل کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے کا کام جنگی پیمانے پر کیا جائے اور اسے ایک تحریک کی شکل دی جائے، عید جیسے مواقع اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہیں جب لوگ بڑی تعداد میں عید گاہوں اور مرکزی مساجد میں جمع ہوتے ہیں، ائمہ اور خطباء کو ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے تا کہ مسلمانوں کی یہ عید صحیح معنوں میں مبارک ومسعود بن سکے۔

قربانی: جذبۂ اطاعت کا عملی پیکر

اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مسلمانوں کو اجتماعی طور پر خوشی اور مسرت کے اظہار کے لیے دو دن عطا کیے ہیں، ان میں سے ایک عید الفطر ہے جو رمضان کے اختتام پر آتی ہے، اور دنیا بھر کے مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس توفیق پر کہ اس نے رمضان المبارک میں اپنی عبادت کی سعادت عطا کی بہ طور شکر خالق کائنات کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور دوسرا عید الاضحیٰ کا دن ہے، یہ دن ایک عظیم واقعے کی یادگار کے طور پر منایا جاتا ہے، مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ ایک عظیم تاریخی دن ہے، آج ہی کے دن اللہ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں ذبح کیا تھا، اللہ رب العزت کو اپنے پیغمبر کی یہ قربانی اس قدر پسند آئی کہ ان کا جگر گوشہ بھی صحیح سلامت قربان گاہ سے واپس آیا، اور اس دن کو ایک قومی یادگار بھی بنا دیا گیا، قیامت تک مسلمان اس واقعے کی یادگار کے طور پر اپنے رب کی بارگاہ میں قربانی پیش کرتے رہیں گے۔

قربان عربی کا لفظ ہے۔ یہی لفظ اردو میں قربانی بن کر استعمال ہوتا ہے، قربان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو قرب خداوندی کے حصول کا ذریعہ ہو، خواہ وہ چیز جان دار ہو، یا بے جان، اسی لیے اس عمل صالح کو بھی قربان کہتے ہیں جس کے ذریعے اللہ کی رحمت سے قریب ہونے کی نیت کی جائے، شریعت کی اصطلاح میں اس ذبیحے کو قربانی کہتے

ہیں جو اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، قربانی کا تصور نیا نہیں ہے، بلکہ یہ تخلیق کائنات کی ابتدا سے چلا آرہا ہے۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل نے قربانی پیش کی، ہابیل نے کچھ بھیڑیں اور قابیل نے کچھ غلہ قربان کیا، ان دونوں کی قربانیوں کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے، ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی رد کر دی گئی، سابقہ مذاہب میں قربانی کی قبولیت کے لیے یہ علامت مقرر کر دی گئی تھی کہ آسمان سے آگ کا شعلہ لپکتا اور قربانی کے لیے رکھی ہوئی چیز کو خاکستر کر دیتا، اس سے سمجھ لیا جاتا تھا کہ فلاں شخص کی قربانی قبول کر لی گئی ہے۔ اور جس شخص کی قربانی جوں کی توں باقی رہ جاتی اس کے متعلق یہ یقین کر لیا جاتا کہ اس کی قربانی مسترد کر دی گئی ہے، اس کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے ایک قربان گاہ بنائی جس میں قربانی کرنے کے لیے جانور رکھے جاتے تھے، شریعت موسوی میں بھی قربانی کا رواج تھا، عیسائیوں میں قربانی کا دستور نہ تھا، البتہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی جان کی قربانی دے کر سارے عالم کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے، سب سے بڑی قربانی جس کا ذکر قرآن کریم میں نہایت صراحت کے ساتھ موجود ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی تھی، جنھوں نے ایک خواب کی بنیاد پر اپنے عزیز بیٹے کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کا ذکر قرآن کریم کی سورۃ الصافات کی آیات (۱۰۲-۱۱۰) میں اس طرح موجود ہے کہ جب حضرت اسماعیل کچھ بڑے ہو گئے اور وہ اپنے والد کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں، آپ نے اس خواب کو محض خواب سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے حکم الٰہی سمجھا، کیوں کہ انبیاء کے خواب بھی سچے ہوتے ہیں، اب ضروری تھا کہ باپ اپنے بیٹے سے خواب کا ذکر کریں، چنانچہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو بتلایا کہ انھوں نے خواب دیکھا ہے کہ جیسے میں تمھیں ذبح کر رہا ہوں، اب تم بتلاؤ تمھاری کیا رائے ہے؟ بیٹے نے خواب سنتے ہی کسی توقف کے بغیر کہا کہ ابا جان آپ تعمیل حکم میں تاخیر نہ کریں، میں ذبح ہونے کے لیے تیار ہوں، تصور کیجیے اس وقت باپ بیٹے کے دلوں کی کیا کیفیت ہوگی، ایک طرف باپ کے دل میں بیٹے کی فطری محبت اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کہ اس عزیز بیٹے کو ہماری خوشی کے لیے قربان کر دو، بیٹا بھی کس قدر فرماں بردار اور اطاعت شعار کہ اس نے ذرا ملال نہیں کیا نہ رویا چیخا نہ واویلا کیا بلکہ خوشی خوشی اپنے والد کے خواب کی تعبیر بننے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم فرشتوں کے ذریعے بھی دیا جا سکتا تھا جیسا کہ عموماً فرشتے ہی وحی الٰہی انبیائے کرام تک پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن خواب میں ذبح کا منظر دکھلانے کے پیچھے بہ ظاہر یہ حکمت تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت شعاری اپنے کمال کے ساتھ ظاہر ہو، خواب میں جو حکم دیا جاتا ہے اس میں نفس انسانی کے لیے تاویلات کی بڑی گنجائش ہوتی ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کسی طرح کی کوئی تاویل نہیں کی بلکہ حکم الٰہی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، پھر باپ نے بیٹے سے اس کی رائے معلوم کی، یہ استفسار کسی تردد کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اپنے بیٹے کو آزمانا تھا کہ اس کی تربیت پیغمبرانہ اصولوں کے مطابق ہوئی ہے یا نہیں؟ نیز اس کے دل میں حکم الٰہی کے آگے سرنگوں ہونے کا جذبہ پوری طرح موجود ہے یا نہیں؟ یوں بھی انبیاء علیہم السلام اگرچہ اطاعت حکم کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں، لیکن ان کا طرز عمل سہولت اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے، اگر حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو کچھ کہے بغیر ذبح کرنے لگتے تو یہ دونوں کے لیے مشکل کا سبب ہوتا، یوں بھی کسی کو غفلت میں مار دینے اور کسی کا بہ رضا و رغبت جان کا نذرانہ پیش کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے، کامل اطاعت اور مکمل جذبۂ انقیاد کی صرف یہی ایک صورت تھی کہ باپ بیٹے دونوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم

ہو کہ ان کا عمل اللہ کو راضی کرنے کے لیے ہے، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے سے سب کچھ صاف صاف بتلادیا اور بیٹے نے بھی پیغمبرانہ اولوالعزمی کا ثبوت دیا اور بلاتوقف عرض کیا یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (الصافات: ۱۰۲) ''ابا جان آپ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کریں'' یہ الفاظ صاف بتلارہے ہیں کہ بیٹے نے اپنے والد بزرگوار کے خواب کو محض خواب نہیں سمجھا بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھا، اور اسی لیے انھوں نے اپنے والد سے درخواست کی کہ وہ اس حکم پر بلاچون وچرا عمل کریں۔

اس جملے سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے دل میں جاں سپاری کا بے پناہ جذبہ موجود تھا، اور وہ کم سنی کے باوجود اپنی جان قربان کرنے کے لیے بہ خوشی راضی ہوگئے، وہیں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نوعمری کے باوجود کہ ابھی صرف تیرہ برس کے تھے نہایت ذہین بھی تھے، اور یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ میرے والد اللہ کے پیغمبر ہیں اور پیغمبروں کا خواب بھی وحی ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی گفتگو میں کسی حکم الٰہی کا حوالہ نہیں دیا تھا بلکہ محض اپنا خواب بیان کیا تھا، بیٹا جان بچانے کو یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ ابا جان یہ محض خواب ہے، آپ اسے خواب سمجھ کر نظرانداز کردیں، مگر انھوں نے نہ کوئی تردد کیا نہ کسی تاویل کا سہارا لیا، نہ باپ کو غم زدہ کرنے کی کوشش کی، بلکہ خوشی خوشی قربان گاہ کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دیئے ''سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (الصافات: ۱۰۲) آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے''۔ اس جملے میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے انتہائی ادب اور کمال تواضع کی جھلک ملتی ہے، ایک طرف تو انھوں نے ان شاء اللہ کہہ کر معاملے کو اللہ کے حوالے کردیا، اور دعوئ صبر میں عُجب و پندار کی متوقع آمیزش کا خاتمہ کرڈالا، دوسرے یہ نہیں کہا کہ مجھے آپ صبر کرنے والا پائیں گے، بلکہ یہ کہا کہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، گویا صبر وضبط میرے ہی ساتھ خاص نہیں ہے

بلکہ اللہ کے اور بھی بندے ہیں جو ایسے سخت حالات میں صبر وضبط کا دامن تھامے رہتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اسی حُسنِ ادب کو علامہ اقبالؒ نے اس شعر میں کس قدر شاندار خراج تحسین پیش کیا ہے:

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

اس کے بعد قرآن کریم نے اس واقعے کی منظر کشی نہیں کی جس کا ذکر کیا جارہا ہے، یہ تو بتلایا کہ دونوں باپ بیٹے اللہ کے حکم کی تعمیل میں سرنگوں ہوگئے، اور انھوں نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ وہ اس خواب کو حقیقت کا پیرہن پہنا کر رہیں گے، فَلَمَّا اَسْلَمَا (الصافات: ۱۰۳) ''ان دونوں نے سر تسلیم خم کردیا'' یہاں لفظ لمّا مذکور ہے قاعدے میں اس کا جواب آنا چاہیے کہ آخر سر تسلیم خم کرنے کے بعد کیا واقعہ پیش کیا کس طرح باپ نے اپنے نور نظر کی گردن پر چھری چلائی، اور کس طرح بیٹے نے اپنی جان؛ جان آفریں کے سپرد کی، مفسرین نے لکھا ہے کہ جواب لمّا اس لیے مذکور نہیں کہ باپ بیٹے کی فدائیت کا منظر اتنا عظیم اور اتنا عجیب وغریب تھا کہ الفاظ میں اس کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی، بعض مجرد حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جنھیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا محض محسوس کیا جاسکتا ہے، یہ بے نظیر واقعہ بھی کچھ اسی نوعیت کا تھا۔

تفسیری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر کو لے کر چلے تو راستے میں تین جگہ شیطان نے انھیں بہکانے اور ورغلانے کی کوشش کی، تینوں مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سات سات کنکریاں مار کر اسے بھگادیا عرفات سے واپسی کے بعد منی میں آج تک تینوں جمرات پر اسی ادائے ابراہیمی کی یاد کے طور پر شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں، شیطان کو دھتکارتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے کے ساتھ قربان گاہ پہنچے، اور حکم پر عمل کی تیاری شروع کی

فرماں بردار بیٹے نے عرض کیا کہ ابا جان آپ مجھے اچھی طرح باندھ دیجیے تا کہ میں زیادہ نہ تڑپوں، کہیں میرا اضطراب اور تڑپ دیکھ کر آپ بے چین نہ ہو جائیں، آپ دامن کو بھی سنبھال کر رکھئے کہیں وہ میرے خون سے تر نہ ہو جائے اور آپ کے خون آلودہ کپڑے دیکھ کر میری امی کو غم نہ ہو، اپنی چھری کی دھار بھی تیز کر لیجیے تا کہ وہ جلد سے جلد میرا گلا کاٹ ڈالے، اور میرا دم آسانی کے ساتھ نکل جائے، میری امی کو میرا اسلام کہیےاور میرا یہ کرتا انھیں دے دیجیے تا کہ ان کے بے چین اور مضطرب دل کے لیے وجہ سکون بن سکے بیٹے کی یہ گفتگو باپ نے سنی، اُن کے دل کی کیفیت کیا رہی ہوگی، ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے، شاید ہی کوئی شقی القلب انسان ایسا ہوگا جس کا کلیجہ یہ الفاظ سن کر شق نہ ہو، یقیناً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل پر بھی غم کا پہاڑ ٹوٹ رہا ہوگا، مگر وہ کوہِ استقامت بن کر کھڑے رہے، اور بیٹے سے فرمایا کہ تم کتنے اچھے ہو کہ خدا کے حکم کی تعمیل میں میری مدد کر رہے ہو، یہ کہہ کر انھوں نے بیٹے کی پیشانی چومی اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دیئے اور اوندھے منہ لٹا دیا، اسی کو قرآن کریم نے ان دو لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے: وَتَلَّهُ لِلْجَبِيْنِ (الصافات: ۱۰۳) ''اور بیٹے کو کروٹ کے بل لٹا دیا''۔ بعض روایات میں ہے کہ پہلے انھیں سیدھا لٹایا تھا، لیکن جب چھری گردن پر پھیری اور اس نے اپنا کام نہیں کیا تو بیٹے نے کہا ابا جان آپ منہ کے بل لٹا دیجیے، ایسا لگتا ہے کہ میرا چہرہ آپ کی نظروں کے سامنے ہونے کی وجہ سے ہاتھ پوری قوت سے کام نہیں کر رہے ہیں، اس کے بعد انھیں اوندھے منہ لٹایا اور گردن پر چھری چلا دی، لیکن چھری نے اپنا عمل نہیں کیا، حکم الٰہی کے بغیر چھری کی کیا مجال تھی کہ وہ گردن کاٹ دیتی، آسمان سے آواز آئی، بس بہت ہوا، تم نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، تم دونوں اس آزمائش میں پورے اترے، اصل مقصود محبت و وفاداری کا امتحان لینا تھا کہ تم ہمارے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز تو نہیں رکھتے، آج کے عمل سے ثابت ہو گیا واقعی تمھارے دل میں صرف ہماری محبت ہے، بیٹے کے بجائے

اس مینڈھے کی قربانی کرو۔ یہ واقعہ قرآن کریم کی ان آیات میں مذکور ہے: وَنَادَيْنَاهُ اَنْ يَّا اِبْرَاهِيْمُ، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِيْ الْمُحْسِنِيْنَ، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِيْنُ، وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (الصافات: ۱۰۴-۱۰۷) ''ہم نے ان کو پکار کر کہا کہ اے ابراہیم تم نے خواب کو سچ ثابت کر دکھایا، ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ کھلی آزمائش تھی اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا تھا''۔

تاریخ میں یہ واقعہ ایک نادر واقعے کے طور پر یاد رکھا گیا، تمام آسمانی کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے، قرآن کریم نے بھی اس کو اپنے خاص دعوتی اور اصلاحی اسلوب میں بیان فرمایا ہے، مختلف مذاہب میں قربانی کا جو تصور ملتا ہے انھوں نے اسی عظیم الشان واقعے سے روشنی اور رہ نمائی حاصل کی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے باقاعدہ ایک سنت پیغمبری کے طور پر زندہ رکھا اور اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ ہر سال مخصوص ایام میں قربانی کریں اور وفاداری اور جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں، فرمایا: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (الکوثر: ۲) ''اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے''۔

قربانی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے شعائرِ اسلام میں سے قرار دیا گیا ہے، قرآن کریم میں ہے: وَالْبُدْنَ جَعَلْنَاهَا لَكُمْ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ كَذٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ، لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدَاكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ، (سورۃ الحج: ۳۶-۳۷) ''قربانی کے اونٹ اور گائے اور اسی طرح بھیڑ بکری کو بھی ہم نے اللہ (کے دین)

کر دیا گیا ہے۔ ان (جانوروں) میں تمہارے فائدے ہیں، سوتم ان پر کھڑے کر کے (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیا کرو، پھر جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں) تو تم خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے اور نہ کرنے والوں کو بھی کھانے کو دو، اور ان (جانوروں) کو اس طرح تمہارے زیر حکم کر دیا تا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو، اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے، تا کہ تم (اللہ کی راہ میں ان کو قربان کر کے) اللہ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اخلاص والوں کو خوش خبری سنا دیجیے"۔

شعائر ان امور کو کہتے ہیں جن سے اسلام کی عظمت اور شوکت ظاہری ہوتی ہے اور جن کی حفاظت ضروری ہے ان آیات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قربانی کی روح تقویٰ ہے، نہ خون بہانا اہم ہے اور نہ گوشت کھانا، جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے یہاں نہ ان جانوروں کا گوشت پہنچے گا اور نہ ان کا خون، صرف تقویٰ پہنچے گا۔ تقویٰ کیا ہے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے ایک وعظ کے دوران ارشاد فرمایا "قربانی کی ایک صورت ہے اور ایک روح ہے، صورت تو جانور کا ذبح کرنا ہے اور اس کی حقیقت ایثار نفس کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور تقرب الی اللہ ہے تو ظاہر ہے یہ روح بغیر جانوروں کے کیسے حاصل ہوگی، اللہ تعالیٰ نے جو صورت مقرر کر دی ہے وہی اختیار کرنی پڑے گی تب روح اس میں ڈالی جائے گی اگر وہ کسی چیز کی قربانی طلب کریں تو قربانی دینی ہوگی یہی تقویٰ ہے۔ (خطبات حکیم الاسلام ۲: ۳۹۱)

بیسے قربانی کی وہ صورت واقعہ جس سے ذبح اسماعیل کا اقدام جذبۂ اطاعت کا عملی پیکر بن گیا اور اس شان سے بنا کہ جب تک دنیا میں اللہ کا نام لیا جاتا رہے گا صبر واستقامت اور ایثار وقربانی کا یہ عملی پیکر بھی روشن اور تابندہ رہے گا۔

عیدالاضحیٰ - فضائل اور مسائل

قربانی کی تاریخ:

قربانی کا تعلق حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) کی زندگی کے واقعات سے ہے، اس لیے قربانی کی تاریخ کا علم حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم پیغمبر خدا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے ان واقعات پر بھی نظر ڈالیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہر صاحب استطاعت انسان پر قربانی واجب قرار دی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق ایک بت پرست قوم سے تھا، خود ان کا باپ آزر بھی بت پرست تھا، بلکہ وہ بت بنا کر فروخت بھی کیا کرتا تھا بت پرستی کے اس ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں، لیکن کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی امانت نبوت کا بوجھ اٹھانے والے تھے اس لے ان کے دل میں بت پرستی سے شدید ترین نفرت تھی قرآن کریم میں مذکور ہے کہ انہوں نے بت خانے میں جا کر چھوٹے بڑے تمام بتوں کو توڑ ڈالا تھا، صرف ایک بت باقی رہنے دیا جو تمام بتوں میں جسامت وغیرہ کے اعتبار سے بڑا تھا، شور ہوا کہ بت توڑ دیئے گئے ہیں، تحقیق کی گئی کہ یہ کام کس نے کیا ہے، کسی نے مخبری کی کہ ایک بچے نے جس کا نام ابراہیم ہے ہمارے بتوں کو توڑا ہے انہیں بلوایا گیا، انہوں نے کہا شاید بڑے بت نے توڑا ہو تب ہی وہ صحیح سلامت کھڑا ہے، بت پرستوں نے شرمندہ ہو کر کہا یہ کیسے توڑ سکتا ہے؟ اس جواب نے حضرت

ابراہیم کو یہ موقع دیا کہ قوم کے سامنے بتوں کی بے بسی اور بے کسی کا منظر کھینچیں کہ جو بت نہ بول سکتے ہوں، نہ کھا پی سکتے ہوں حد یہ ہے کہ اپنے اوپر سے مکھی تک نہیں اڑا سکتے تم انہیں معبود مانتے ہو، ان کی پرستش کرتے ہو، مگر قوم پر اس دعوت وتبلیغ کا کوئی اثر نہیں ہوا، اور وہ بہ دستور بت پرستی میں مشغول رہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں عقیدۂ توحید کی دعوت دیتے رہے، اس کی پاداش میں انہیں اس وقت کے ظالم بادشاہ نمرود نے آگ میں بھی ڈلوایا، لیکن اللہ نے اس آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم کے لیے سلامتی اور ٹھنڈک بن جائے، طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں سہنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وطن عراق سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے اور شام تشریف لے گئے، (یہ واقعہ قرآن کریم کی سورۃ الانبیاء میں مذکور ہے)۔

ہجرت کے بعد آزمائش کا نیا سلسلہ:

ہجرت بہ جائے خود بڑی آزمائش ہے، بہت سے انبیاء کو دین کے راستے میں آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اس آزمائش سے گزرے، شام تشریف لے جارہے تھے، راستے میں ایک ایسے ملک سے گزر ہوا جہاں کا بادشاہ ظالم بھی تھا اور بد اطوار بھی تھا، وہ اجنبی لوگوں اور مسافروں کی تاک میں رہتا، مردوں کو مار پیٹ کر چھوڑ دیتا، یا انہیں قتل کرادیتا اور عورتوں کو اپنے حرم میں داخل کرلیتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہؓ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا کہ اس نے حضرت ابراہیم کو تو چھوڑ دیا اور حضرت سارہؓ کو محل میں پہنچادیا رات میں جب اس ظالم بادشاہ نے غلط ارادے سے حضرت سارہؓ کی طرف اپنا گندہ ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو اس کا ہاتھ شل ہوگیا، اس نے حضرت سارہؓ سے درخواست کی کہ اے اللہ کے نیک بندی میرے لیے دعا کر کہ میرا ہاتھ صحیح ہوجائے، حضرت سارہؓ نے دُعا کی، اس ظالم کا ہاتھ صحیح ہوگیا، اس نے پھر غلط ارادہ کیا، اس کے ساتھ پھر یہی

معاملہ ہوا تب اس نے حضرت سارہؓ کو بہ حفاظت واپس کرنے ہی میں عافیت محسوس کی اور ایک باندی بھی انہیں دی جس کا نام ہاجرہ تھا، یہ وہی ہاجرہؓ ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری اہلیہ محترمہ ہیں اور جن کے بطن سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ (بخاری ۳/۱۲۲۵، رقم الحدیث ۳۱۷۹)

حضرت اسماعیل کی ولادت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت ہجرت کی اس وقت آپ کی عمر چھیاسی سال تھی، حضرت سارہ بھی بوڑھی ہوچکی تھی، یہ دونوں میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم تھے، ہجرت کا حکم ملا تو روانگی کے وقت انہوں نے اپنے رب سے یہ دُعا کی: رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِيْنَ (الصافات: ۱۰۰) "اے میرے پروردگار مجھے ایک نیک بیٹا عطا فرما" یہ دعا بارگاہ الٰہی میں قبولیت سے سرفراز ہوئی، قرآن کریم میں ہے: فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيْمٍ (الصافات: ۱۰۰) "تب ہم نے ان کو ایک بردبار لڑکے کی خوش خبری دی" وہ لڑکا جس کی بشارت قرآن کریم میں دی گئی ہے اس سے مراد حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/۱۸۶)

بے آب وگیاہ وادی میں قیام کا حکم:

پہلے ظالم بادشاہ نمرود کے مظالم، پھر ہجرت کا واقعہ، اس کے بعد مصر کے ظالم بادشاہ کے ذریعے گرفتاری اور رہائی، بڑی آرزوؤں اور دعاؤں کے بعد بیٹے کی پیدائش، مگر جیسا کہ عرض کیا گیا کہ پیغمبروں کے ساتھ آزمائش کا سلسلہ لگا رہا ہے، چنانچہ جب اسماعیل شیر خوار ہی تھے تو رب کریم کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ اپنے بچے اور بیوی کو لے جائیں اور ایسی وادی میں چھوڑ کر آجائیں جہاں نہ آبادی ہے، نہ پانی ہے بالکل ویران اور بے آب وگیاہ پتھریلا علاقہ ہے، حکم خداوندی کی تعمیل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ اور شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیل کو لے کر

چلے اور جس جگہ ان دونوں کو چھوڑنے کا حکم ہوا تھا چھوڑ کر واپس چل دیے، اس وقت حضرت ہاجرہؓ کی کیا کیفیت تھی اور وہ اپنے شوہر سے کیا پوچھ رہی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں کیا جواب دیا تھا یہ واقعہ بڑے دل نشیں انداز میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ نے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے شیر خوار بیٹے حضرت اسماعیل اور اپنی اہلیہ محترمہ حضرت ہاجرہؓ کے ساتھ اس جگہ پہنچے جہاں آج خانہ کعبہ ہے، اس وقت یہ جگہ بالکل ویران اور غیر آباد تھی، دور دور تک پانی بھی نہیں تھا، صرف ایک درخت تھا جو چاہ زمزم کے پاس خانہ کعبہ کے بالائی حصے میں تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان دونوں کو اس جگہ چھوڑ دیا اور ایک تھیلے میں کھجور اور ایک مشکیزے میں پانی رکھ کر واپسی کے لے روانہ ہو گئے، حضرت ہاجرہؓ نے یہ منظر دیکھا تو پیچھے پیچھے دوڑیں اور کہنے لگی کہ آپ ہمیں اس ویران اور غیر آباد جگہ چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں، انہوں نے بار بار یہ سوال کیا لیکن حضرت ابراہیم بالکل خاموش رہے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے قدم بڑھاتے رہے، آخر کار حضرت ہاجرہؓ نے خود ہی پوچھا کہ کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں، اس پر حضرت ہاجرہؓ نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا تب اللہ تعالیٰ ہمیں ضائع نہیں کریں گے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک ایسے ٹیلے پر پہنچے جہاں سے وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو دیکھ نہیں پا رہے تھے تو یہ دُعا کی کہ: رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُم مِّنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ (ابراهیم: ۳۷) ''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں جو بے آب وگیاہ ہے تیرے قابل تعظیم گھر کے پاس آباد کر دیا ہے، اے ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز قائم کریں، آپ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دیجئے اور انہیں پھل عطا کیجئے

تا کہ یہ لوگ شکر ادا کریں''۔ اس دُعا کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام رخصت ہو گئے، حضرت ہاجرہؓ کچھ دن تک کھجور اور پانی استعمال کرتی رہیں، لیکن جب پانی ختم ہو گیا خود بھی پیاس سے بے تاب ہو گئیں اور بچہ بھی بھوک سے بلبلانے لگا، پہلے تو بچے سے دور جا کر بیٹھ گئیں پھر پانی کی تلاش میں صفا پہاڑی پر چڑھیں، پھر بیٹے کے پاس واپس آئیں، پھر مروہ کی طرف دوڑیں، اس طرح انہوں نے صفا مروہ کے سات چکر لگائے، ساتویں مرتبہ مروہ سے واپس لوٹیں تو دیکھا کہ ایک فرشتے نے اپنے بازو سے اس جگہ ایک گڑھا کر دیا ہے جہاں آج چاہ زمزم ہے، اس گڑھے سے پانی ابل رہا ہے پانی کو دیکھ کر پہلے جانوروں نے ادھر کا رخ کیا پھر انسانوں کے قافلے آ کر ٹھہرنے لگے اس طرح وہ غیر آباد جگہ (مکہ) آباد ہو گئی (بخاری: ۳/۱۲۲۷، رقم الحدیث: ۳۱۸۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خواب:

ایسا نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ماں بیٹے کو اس ویرانے میں چھوڑ کر ان کی خبر نہ لی ہو، بلکہ گاہے بہ گاہے وہ ان کی خبر گیری اور پرسش احوال کے لیے تشریف لایا کرتے تھے، یہاں تک کہ بیٹا بڑا ہو گیا، اب آزمائش کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا، قرآن کریم کی سورۂ الصافات میں یہ قصہ مذکور ہے اور مفسرین نے اپنی تفاسیر میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، جب بیٹا سن شعور کو پہنچ گیا اور اس قابل ہو گیا کہ باپ کے ساتھ چلنے پھرنے لگے (بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس وقت حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ سال تھی: تفسیر مظہری: ۸/۱۲۸) تو ایک دن حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا کہ اے بیٹے! میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں روایات میں ہے کہ یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسلسل تین روز تک دیکھا (تفسیر قرطبی: ۱۵/۸۸) جہاں تک انبیاء کے خواب کی بات ہے یہ بھی وحی ہوتے ہیں یہ عام آدمی کا خواب نہیں تھا بلکہ ایک نبی کا خواب تھا جس پر عمل ضروری تھا، یہاں بے شک

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکم ہی دینا تھا تو خواب کی کیا ضرورت تھی، فرشتے کے ذریعے بھی وحی بھیجی جاسکتی تھی، اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال انقیاد اور تسلیم و رضا کی آزمائش کرنا چاہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام خواب کی بات پر بھی عمل کرتے ہیں یا نہیں، یا اس خواب کی تاویل تلاش کرتے ہیں لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اطاعت اور فرماں برداری کا وہی انداز اختیار کیا جو پیغمبرانہ شان کے مطابق تھا اور انسانی فطرت کے تقاضے سے خواب کو نظر انداز کرنے کے بہ جائے اس پر عمل کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے (تفسیر کبیر امام رازی....)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے سے کیا کہا؟

قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب تم یہ بتلاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ باپ نے بیٹے سے یہ سوال اس لیے نہیں کیا کہ انہیں اس سلسلے میں کوئی تردد تھا اور وہ بیٹے کے تذبذب یا انکار کو بہانہ بنانا چاہتے تھے، بلکہ اس کا مقصد بیٹے کو آزمانا تھا کہ دیکھیں اس میں حکم الٰہی کی اطاعت کا کس قدر جذبہ پیدا ہوا ہے، پھر احکام الٰہی کی تبلیغ میں انبیاء کرام کا اسوہ اور طرز عمل ہمیشہ حکیمانہ رہا ہے، اس سوال میں بھی یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ بیٹا اطاعت کے لیے دل سے تیار ہو جائے، اور اسے سر تسلیم خم کرنے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں خود کو ذبح کے لیے پیش کیا ہے، اگر حضرت ابراہیم اپنے بیٹے کو حکم الٰہی سے بے خبر رکھ کر ذبح کر دیتے تو خود تو اطاعت کی سعادت سے سرفراز ہوتے لیکن بیٹے کو یہ سعادت میسر نہ آتی، ویسے بھی سہولت اسی میں ہے کہ ذبح کی اذیت سہنے کے لیے پہلے سے تیاری اور آمادگی ہو، یہ بھی مقصد تھا کہ اگر بیٹے کے دل میں کسی طرح کا کوئی تذبذب ہو تو اسے سمجھایا جاسکے کیوں کہ وہ بہ ہر حال بچے تھے، اگرچہ ایک اولوالعزم پیغمبر کے بیٹے

تھے اور خود بھی منصب رسالت پر فائز ہونے والے تھے (تفسیر بیان القرآن ۳/۲۵۳)

بیٹے نے کیا جواب دیا؟

بیٹے نے وہی جواب دیا جس کی توقع ایک خوش قسمت باپ کو اپنے سعادت مند بیٹے سے تھی، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جواب میں کہا کہ ابا جان آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ اس کی تعمیل کریں، اس جواب سے جہاں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت اسماعیل یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ ابا جان یہ تو ایک خواب ہے، خواب کو حقیقت مت سمجھئے مگر وہ جانتے تھے کہ یہ عام آدمی کا خواب نہیں، بلکہ ایک نبی کا خواب ہے جو سچا ہوتا ہے نبی کا خواب بھی وحی الٰہی ہی کی طرح ہے، خواب میں دیئے گئے حکم کی اطاعت بھی ضروری ہے، پھر یہی نہیں کہ بیٹے نے باپ سے یہ عرض کیا کہ آپ اس حکم کی تعمیل کریں جو آپ کو دیا گیا ہے، بلکہ اپنے والد کے اطمینان کے لیے یہ بھی کہا کہ آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ جواب کسی ناسمجھ بچے کا جواب نہیں لگتا بلکہ اس میں پیغمبرانہ شان جھلکتی ہے ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنے کمال صبر کو مشیت ایزدی پر موقوف رکھا یعنی یہ نہیں کہا کہ میں اس تکلیف پر صبر کروں گا، بلکہ یہ کہا کہ اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، گویا اس معصوم بچے کو یہ معلوم ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر کائنات میں کچھ ہونے والا نہیں ہے، میرا صبر، میری اطاعت سب کچھ اسی کی مرضی پر موقوف ہے، دوسری طرف انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے بلکہ یہ عرض کیا کہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، یہ بھی گفتگو میں تواضع اور انکساری کی ایک نمایاں مثال ہے کہ صبر کو خود اپنی ذات کی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ یہ واضح کر دیا کہ ایک میں ہی صبر کرنے والا نہیں ہوں بلکہ اور بھی بہت سے لوگ صبر کرنے والے ہیں۔

حکم الٰہی کی تعمیل کا وقت آپہنچا:

اب تک بات دل میں تھی، یا زبان پر تھی، اب اس کے عملی اظہار کا وقت قریب آپہنچا، باپ بیٹے دونوں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کے لیے تیار ہیں، قرآن کریم نے دونوں کی اطاعت کو یکساں درجہ پر رکھا اور کہا: فَلَمَّآ اَسْلَمَا (جب وہ دونوں جھک گئے) اَسْلَمَ کے معنی ہیں جھک جانا، مطیع وفرماں بردار ہو جانا، قرآن کریم کی اس دل کش تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں حضرات اللہ کے حکم کے سامنے جھک گئے نہ صرف دل اور زبان سے بلکہ عمل سے بھی اور خواب میں ذبح کا جو طریقہ بتلایا گیا تھا اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے گھر سے نکلے، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں لَمَّا (جب) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کا جواب مذکور نہیں ہے، یعنی یہ نہیں بتلایا گیا کہ جب باپ بیٹے دونوں اطاعت کے جذبے سے سرشار ہو کر تعمیل حکم کے لیے چلے تو کس طرح کے واقعات پیش آئے، دونوں کی کیا کیفیت تھی اور ان کے جسمانی اعضاء کی حرکات سے کیا ظاہر ہو رہا تھا، اس بات سے یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ باپ بیٹے کا یہ عملی اقدام فداکاری اور جاں نثاری کا ایک ایسا عجیب وغریب منظر تھا کہ اسے الفاظ کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا، اس لیے قرآن کریم نے باقی واقعات کی منظر کشی کرنے کے بجائے اس ایک واقعے کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو اس تمام قصے کا لب لباب اور نچوڑ ہے۔

قرآن کریم تو خاموش ہے البتہ بعض معتبر تفسیری اور تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قربان گاہ تک پہنچتے پہنچتے راستے میں شیطان نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تین مرتبہ بہکانے کی کوشش کی، ہر مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کو سات کنکریاں مار کر بھگا دیا، تین مرتبہ شیطان کو کنکریاں مارنے کا یہ عمل اللہ کو اس قدر پسند آیا کہ قیامت تک کے لیے حج کے اعمال میں اسے شامل کر دیا، منی کے تین جمرات پر شیطان کو جو کنکریاں ماری جاتی ہیں وہ اسی محبوب عمل کی یادگار ہیں، جب یہ

دونوں باپ بیٹے قربان گاہ پر پہنچے اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے ارادے سے زمین پر لٹانا چاہا تو بیٹے نے اپنے والد سے عرض کیا کہ ابا جان آپ مجھے اچھی طرح باندھ دیجئے تاکہ میں زیادہ نہ تڑپ سکوں، اپنے کپڑے بھی سنبھال کر رکھئے تاکہ وہ میرے خون کی چھینٹوں سے آلودہ نہ ہوں، آپ کے کپڑوں پر میرے خون کی چھینٹیں دیکھ کر میری امی کو دکھ ہوگا، آپ اپنی چھری کی دھار بھی تیز کر لیجئے اور میرے حلق پر جلدی جلدی پھیرئے تاکہ میرا دم نکلنے میں آسانی ہو کیوں کہ موت بڑی سخت چیز ہے واپس جا کر میری امی کو میرا اسلام کہہ دیجئے گا اگر آپ چاہیں تو میرے کپڑے ان کے پاس لیتے جائیں شاید انہیں کچھ تسلی ہو، تصور کیجئے ایک اکلوتا بیٹا قربانی کے لیے تیار ہے اور اس کی زبان سے یہ جملے ادا ہو رہے ہیں، ایک اجنبی یہ جملے سنے تو دل شدت غم سے پھٹ پڑے، چہ جائیکہ ایک محبت کرنے والا باپ اپنے اکلوتے بیٹے سے یہ جملے سن رہا ہو، بیٹا بھی وہ جو بڑھاپے کی مایوسی میں امید کی کرن بن کر چمکا ہو، مگر معاملہ پیغمبر کا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی اور کہنے لگے بیٹے تم اللہ کا حکم پورا کرنے کے لیے میری کس قدر مدد کر رہے ہو، یہ کہہ کر بیٹے کو الوداعی پیار کیا اور پرنم آنکھوں سے ان کے جسم کو باندھنا شروع کر دیا (تفسیر مظہری وغیرہ)

اب پھر قرآن حکیم کی طرف چلتے ہیں باپ نے بیٹے کو زمین پر کروٹ کے بل لٹا دیا، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہیں اس طرح کروٹ سے لٹا دیا کہ پیشانی کا ایک حصہ زمین کو چھونے لگا، حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے اسی تفسیر کو راجح قرار دیا ہے، کیوں کہ لغت کے اعتبار سے بھی یہی راجح ہے، لیکن بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اوندھے منہ لٹا دیا، بعض روایات سے اس طرح اوندھے منہ لٹانے کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ شروع میں انہیں سیدھا لٹایا

گیا تھا لیکن جب چھری چلانے لگے تو گلا نہیں کٹا، اس موقع پر خود بیٹے نے یہ عرض کیا کہ آپ مجھے الٹا لٹا دیجئے کیوں کہ میرا چہرہ دیکھ کر آپ کے دل میں پدرانہ شفقت جوش مارنے لگتی ہے اور چھری اپنا کام نہیں کرتی، یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو اوندھے منہ لٹا دیا اور گلے پر چھری پھیرنی شروع کر دی۔

باپ بیٹے آزمائش میں کامیاب رہے:

دونوں باپ بیٹے اس آزمائش میں کامیاب رہے جو حکم ان دونوں کو ملا تھا اس کی تعمیل میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی، قرآن کریم نے اس کی شہادت ان الفاظ میں دی ہے: وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ. (الصافات: ۱۰۴، ۱۰۵) ”اور ہم نے انہیں آواز دی کہ اے ابراہیم تم نے خواب سچ کر دکھلایا ہے ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں نیکی کرنے والوں کو“ جو حکم ہم نے خواب کی حالت میں تمہیں دیا تھا تم نے اس کی تعمیل میں کوئی کوتاہی نہیں کی، تمہارا کام مکمل ہو چکا ہے، تم آزمائش میں کامیاب رہے، اب اپنے بیٹے کو آزاد کر دو، ہم نیکوکار مخلصین کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں، ہم اسے دنیوی تکلیف سے بھی محفوظ رکھتے ہیں اور آخرت کا اجر و ثواب بھی اس کے نامۂ اعمال میں محفوظ رکھتے ہیں، تمہارا یہ عمل اکارت نہیں گیا بلکہ ہم نے تمہاری یہ قربانی قبول کی اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا: وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۔ (الصافات: ۱۰۵) روایات میں ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک غیبی آواز سن کر اوپر کی طرف دیکھا تو وہاں حضرت جبرئیل امینؑ نظر آئے جو ایک مینڈھا لئے کھڑے تھے یہ ایک جنتی مینڈھا تھا جو اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو عطا فرمایا، انہوں نے اللہ کے حکم سے بیٹے کے بجائے اس مینڈھے کو ذبح کیا، اسے ذبح عظیم اسی لیے کہا گیا ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے تھا اور جو چیز اللہ کی طرف سے بہ طور خاص عطا کی گئی ہو اس کے عظیم اور

مقبول ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے (ملخص از تفسیر معارف القرآن: ۷/۱۱)

قربانی کیا ہے؟

یہ ہے قربانی کا وہ تاریخی واقعہ جس کی یاد باقی رکھنے کے لیے اہل اسلام پر قربانی لازم قرار دی گئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! قربانی کی حقیقت کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے والد ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے، صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا ہمارے لیے اس میں کیا اجر و ثواب ہے، فرمایا ہر جانور کے ہر بال کے عوض ایک نیکی (تمہارے) نامۂ اعمال میں لکھی جائے گی (ابن ماجہ: ۲/۱۰۴۵، رقم الحدیث: ۳۱۲۷، مسند احمد بن حنبل: ۴/۳۶۸، رقم الحدیث: ۱۹۳۰۲) حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنی ایک تقریر میں ارشاد فرمایا کہ اصل میں قربانی کی حقیقت تو یہ تھی کہ عاشق خود اپنی جان کو اللہ کے حضور میں پیش کرتا، مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے اس کو یہ گوارا نہ ہوا اس لیے اس نے یہ حکم دیا کہ تم جانور ذبح کرو، ہم یہی سمجھیں گے کہ تم نے خود اپنے آپ کو قربان کر دیا، جس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم پر اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کا عزم مصمم کیا اور اسے قربان گاہ لے جا کر ذبح کرنے کے ارادے سے اس کے گلے پر چھری پھیری اسی وقت ان کی قربانی قبول کر لی گئی اور فرمایا گیا کہ بے شک آپ نے اپنا خواب سچ کر دکھلایا ہے، ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں، اب ہم اس قربانی کے عوض جنت سے ایک مینڈھا بھیجتے ہیں اور تمہارے بیٹے کی جان کے عوض ایک دوسری جان کی قربانی مقرر کرتے ہیں، چنانچہ اسی دن سے اونٹ بھینس، گائے، مینڈھا، بکرا وغیرہ قربانی کے لیے فدیہ (بدلے) میں مقرر ہو گیا (خطبات حکیم الاسلام: ۲/۳۹۵)

قربانی کا حکم عام ہے:

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قربانی کا واقعہ مکہ مکرمہ میں پیش آیا اور حج کے ایام

میں پیش آیا، اس لیے قربانی کا حکم عام نہیں ہے بلکہ خاص حجاج کے لیے ہے، جس
طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ عمل کہ انہوں نے شیطان کو تین مرتبہ کنکریاں مار کر
بھگایا حجاج کے لیے خاص ہے، جو لوگ حج کرنے نہیں جاتے وہ کنکریاں نہیں مارتے
اسی طرح حضرت ہاجرہؓ کا صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کا عمل بھی حجاج کے لیے
مخصوص کیا گیا ہے، یہ بڑی غلط فہمی ہے، جس میں بعض خود ساختہ دانش ور مبتلا ہیں، ورنہ
حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ عمل جو کسی خاص مقام کے ساتھ مخصوص
ہے وہ حجاج کرام کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اور باقی لوگوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا
گیا ہے جیسے جمرات پر کنکریاں مارنا، کیوں کہ نہ منیٰ دوسرے مقام پر ہے اور نہ وہاں
جمرات موجود ہیں، اسی طرح صفا و مروہ کے سات چکر بھی صرف حجاج کے لیے ضروری
ہیں کیوں کہ صفا و مروہ پہاڑیاں صرف مکہ مکرمہ میں ہیں، جہاں تک قربانی کے
جانوروں کا سوال ہے وہ ہر جگہ موجود ہیں اس لیے ہر جگہ ان کی قربانی کی جاسکتی ہے
اسی لیے پوری امت کے لیے قربانی کو ضروری قرار دیا گیا، قرآن کریم میں ہے:
وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ (الحج: ۳۶) ''اور
قربانی کے اونٹ اور گائے اور اسی طرح بھیڑ، بکری کو بھی ہم نے اللہ کے دین کی یادگار
بنایا ہے ان جانوروں میں تمہارے اور بھی فائدے ہیں'' اگر قربانی صرف حج کرنے
والوں کے لیے ضروری ہوتی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ مدینہ منورہ
میں رہتے ہوئے قربانی نہ کرتے، حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں دس سال قیام فرمایا اور آپ ہر سال قربانی
فرمایا کرتے تھے (ترمذی: ۴/۹۲، رقم الحدیث: ۱۵۰۷)

قربانی کا کوئی بدل نہیں:

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر قربانی کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ

کردی جائے اور غریبوں میں تقسیم کردی جائے تو جانوروں کی کمی بھی واقع نہ ہوگی اور
غریبوں کا بھی بھلا ہو جائے گا، سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرلینی چاہئے کہ قربانی
کرنے سے جانوروں میں کمی واقع ہو جاتی ہے، اس طرح کا خیال صرف اسی شخص
کے دل میں آسکتا ہے جو خدا کی قدرت کاملہ پر مکمل یقین نہ رکھتا ہو، کیا خدا اپنے
بندوں کی ضرورت کے مطابق پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، آج دنیا میں جس قدر آبادی
ہے پہلے کبھی نہ تھی اس وقت بھی ان کی ضرورت کے مطابق غلہ، سبزیاں اور اناج پیدا
ہوتا تھا، اور آج جب کہ یہ آبادی کئی گنا بڑھ چکی ہے پیداوار روز افزوں ہے، کسی وجہ
سے ایک جگہ کمی واقع ہوتی ہے تو اس کی تلافی دوسری جگہ سے کرلی جاتی ہے، چودہ سو
سال سے لگاتار قربانی ہو رہی ہے، کبھی نہیں سنا گیا کہ قربانی کی وجہ سے جانوروں کی
آمد یا پیداوار میں کمی واقع ہوگئی ہو، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں
بھی جانور بہ کثرت موجود تھے، یہاں تک کہ آپ نے حجۃ الوداع میں سو اونٹوں کی
قربانی دی، تریسٹھ اونٹ خود اپنے دست مبارک سے ذبح فرمائے اور باقی حضرت علیؓ
نے ذبح کیے (مسلم) یہ تو تنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانیوں کی تعداد ہے
اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ صحابۂ کرامؓ موجود تھے، انہوں نے بھی حسب استطاعت
قربانی دی، یہ تعداد لاکھوں سے تجاوز کرتی ہے، آخر اتنی بڑی تعداد میں جانور کہاں
سے آتے ہیں، آج بھی پچیس لاکھ حجاج قربانی کرتے ہیں، کبھی نہیں سنا گیا کہ کچھ حجاج
جانوروں کی کمی کی وجہ سے قربانی نہ کرسکے، یہ حکمت الٰہیہ ہے کہ پیداواری چیزیں
کثرت استعمال سے بڑھتی ہیں، گھٹتی نہیں ہیں شب و روز اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، آج
بھی تین دن کے مختصر عرصے میں ساری دنیا کے اندر کروڑوں جانور ذبح ہو جاتے ہیں
کیا کبھی سنا گیا کہ قربانی کے اس بڑے عمل نے جانور کم کردیے ہوں، رہی یہ بات کہ
قربانی کے بجائے جانور کی قیمت صدقہ کردی جائے، یہ بات وہ لوگ کرتے ہیں جو

عبادات کی روح کو نہیں سمجھتے، عبادات میں اصل وہ کام کرنا ہے جو خدا کو مطلوب ہے اگر خدا کو نماز کی حرکات وسکنات مطلوب ہیں تو نماز اسی طرح ادا ہوگی، روزہ مطلوب ہے تو بھوکا پیاسا رہ کر ہی یہ عبادت ادا کی جائے گی، حج عبادت ہے تو وقت اور پیسہ خرچ کر کے مکہ مکرمہ پہنچ کر ہی یہ عبادت ادا ہو سکے گی، یہی حال قربانی کا ہے، اس عبادت کی روح جان دینا ہے اور صدقے کی روح مال دینا ہے، جانور کی قربانی دینا ایسا ہی ہے جیسے بندے نے اپنی جان کی قربانی دے دی ہو، اگر خدا کو صدقہ مطلوب ہوتا تو اس عبادت کے لیے تین دن مخصوص نہ فرماتا، کیوں کہ صدقہ تو کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے، یوں بھی یہ شعائر اسلام میں سے ہے، اور شعائر اسلام میں تبدیلی نہیں ہوتی قربانی اور صدقہ دونوں الگ الگ عبادتیں ہیں دونوں ایک دوسرے کا بدل نہیں بن سکتیں، جیسے نماز روزہ کا بدل نہیں بن سکتی، یا زکوۃ حج کا بدل نہیں بن سکتی، اگر ایک نماز کے عوض لاکھوں روپے خرچ کر دیے جائیں تب بھی وہ نماز ذمے سے ساقط نہ ہوگی یوں بھی عبادات کے باب میں اصل حکم خداوندی ہے، اس میں ہماری عقل نارسا کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اگر قربانی کے بہ جائے صدقہ کرنا کافی ہوتا تو حضرات انبیاء کرامؑ اور ان کے بعد صحابہؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، مفسرینؒ، محدثینؒ اس پر ضرور عمل کرتے، اس کے بہ جائے ان کا عمل قربانی اتنے تواتر سے ثابت ہے کہ اس کا انکار کرنا ممکن نہیں ہے۔

قربانی کی فضیلت:

یہی وجہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں قربانی کے بڑے فضائل وارد ہیں اور جو لوگ واجب ہونے کے باوجود قربانی نہیں کرتے ان کے لیے شدید ترین عذاب کی وعید بھی موجود ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ یعنی عید الاضحیٰ کے دن آدم کے بیٹے کا کوئی عمل

اللہ تعالیٰ کو قربانی سے زیادہ محبوب نہیں، اور قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ (زندہ ہو کر) آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی خدا کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کر لیتا ہے، تم لوگ دلوں کی خوشی کے ساتھ قربانی کیا کرو (ابن ماجہ: ۲/۱۰۴۵، رقم الحدیث: ۳۱۲۶) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے وسعت کے باوجود ہمارے ساتھ قربانی نہیں کی وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے (مستدرک حاکم: ۲/۴۲۲، رقم الحدیث: ۳۴۶۸) قربانی کے بے حساب اجر و ثواب کے متعلق ایک حدیث ابھی ذکر کی جا چکی ہے کہ ہر بال کے بدلے ایک نیکی ملے گی، اس پر صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر (جانور کے بدن پر) اون ہو تو آپ نے ارشاد فرمایا اون کے ہر بال کے بدلے بھی ایک نیکی ہے، اس سوال کا منشأ یہ تھا کہ بعض جانوروں کے جسم پر گائے، بیل، بکری کی طرح بال نہیں ہوتے، بلکہ اون ہوتا ہے جیسے بھیڑ دنبہ، مینڈھا اور اونٹ وغیرہ، سوال کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ اجر صرف بال والے جانوروں میں ہے، اسی لیے انہوں نے اون کا بھی سوال کر دیا، ان جانوروں کے بدن پر بہ ظاہر تو گچھے سے لٹکے رہتے ہیں، لیکن در حقیقت وہ بے شمار بالوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نیکی اون کے ایک گچھے پر نہیں بلکہ اس گچھے کے ہر بال پر ہے،

۱۰/ ذی الحجہ اور عید الاضحیٰ:

یہ محض اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ۱۰/ ذی الحجہ کو اپنے لخت جگر کو قربان کرنے کے حکم کی تعمیل کی، اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندے کا یہ عمل اس قدر پسند آیا کہ اس دن کو امت مسلمہ کے لیے ایک یادگار دن بنا دیا اور اسے عید الاضحیٰ کا دن قرار دے کر ان کے اسوے پر عمل کرنا ضروری قرار دیا، اس دن کو قربانی کے لیے

مخصوص کرنے میں ایک طرف یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ اس طرح ملت حنفی کے دونوں بزرگوں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی زندگی کے اس سبق آموز واقعے سے ایثار اور قربانی کا سبق ملتا ہے، دوسری طرف یہ حکمت بھی ہے کہ اس دن حجاج کرام عرفہ اور مزدلفہ سے فراغت کے بعد منی میں آتے ہیں، قربانی کرتے ہیں، قصر اور حلق کرتے ہیں اور احرام کھول دیتے ہیں، جو لوگ حج کی اس سعادت سے محروم ہیں وہ قربانی کی سنت پر عمل کر کے کسی نہ کسی درجے میں حجاج کرام کے ساتھ شریک ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک گونہ مشابہت اختیار کر لیتے ہیں۔

عشرۂ ذی الحجہ کی فضیلت:

عید الاضحیٰ اسلامی مہینے ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو منائی جاتی ہے، اس مہینے کے ابتدائی دس دنوں کی بڑی فضیلت آئی ہے، ابتدائی نو دنوں کے روزے رکھنا اور دس راتوں میں جاگ کر عبادت کرنا اللہ کو بڑا محبوب ہے، ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک عشرۂ ذی الحجہ کی عبادت سے بڑھ کر کوئی عبادت محبوب نہیں ہے، اس عشرے کے ہر دن کے روزے ایک سال کی عبادت کے برابر ہیں اور اس کی ہر رات کی نفلی نمازیں شب قدر کی نماز کے برابر ہیں۔ (حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح: ۴۰۰) خاص طور پر عیدین کی راتیں تو بڑی مبارک اور مسعود ہیں، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ پانچ راتیں ایسی ہیں جن میں دعا رد نہیں کی جاتی، جمعہ کی رات، رجب کی پہلی رات، شعبان کی پندرہویں رات، عید الفطر کی رات اور عید الاضحیٰ کی رات۔ (البیہقی فی شعب الایمان: ۳/۳۴۲، رقم الحدیث: ۳۷۱۳) حضرت ابوامامہؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کرتے ہیں کہ جس شخص نے عیدین کی راتوں میں ثواب کی نیت سے عبادت کی اس کا دل اس وقت بھی زندہ رہے گا جس دن لوگوں کے دل مر جائیں گے۔ (ابن ماجہ: ۱/۵۶۷، رقم الحدیث: ۱۷۸۲)

محدثین نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت سے مراد قیامت کا دن ہے، اس دن خوف اور مایوسی اور دل شکستگی کا یہ عالم ہوگا کہ لوگ موت کی تمنا کریں گے، مگر وہ لوگ اس اذیت میں مبتلا نہیں ہوں گے جو ان مبارک راتوں میں اللہ کی طرف متوجہ رہیں گے۔ (الترغیب والترہیب: ۲/۱۵۲)

یوم عرفہ کا روزہ:

عید سے ایک دن پہلے حجاج کرام عرفات میں جمع ہو کر حج کا رکن اعظم ادا کرتے ہیں، یہ دن یوم عرفہ کہلاتا ہے، اس دن کی بڑی فضیلت ہے، اگرچہ ہمارے ملکوں میں ذی الحجہ کی نو تاریخ سعودی عرب کی نویں تاریخ سے مختلف ہی کیوں نہ ہو تب بھی اس دن کی اہمیت اور فضیلت کم نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس دن کو ہمارے لیے عرفے کا دن بنا کر بے شمار فضیلتیں رکھ دی ہیں، حدیث شریف میں یوم عرفہ کے روزے کی بڑی فضیلت آئی ہے، ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ عرفے کے دن روزے کے متعلق مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس روزے کو ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا اور عاشورہ کے روزے کے متعلق مجھے اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس روزے کو ایک سال قبل کے گناہوں کا کفارہ بنا دے گا (مسلم: ۲/۸۱۸، رقم الحدیث: ۱۱۶۲) اسی لیے فقہ کی کتابوں میں اس دن کے روزے کو حاجیوں کے علاوہ دوسرے کے لیے مستحب قرار دیا گیا ہے، حاجی کیوں کہ سفر میں ہیں اور حج کے ارکان کی ادائیگی میں مصروف ہیں اس لیے وہ لوگ روزہ نہ رکھیں تو بہتر ہے تاکہ حج کی ادائیگی میں چستی اور نشاط کے ساتھ مشغول رہیں، البتہ اگر کوئی حاجی یہ محسوس کرے کہ روزہ رکھنے سے اس میں نقاہت پیدا نہیں ہوگی تب وہ بھی اس مستحب روزے کا ثواب حاصل کر سکتا ہے۔
(فتاوی تاتارخانیہ: ۲/۲۹۵)

حجاج کے ساتھ شرکت:

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے حج کی فضیلت سے ان بندوں کو بھی محروم نہیں رکھا جو عدم استطاعت یا کسی دوسرے عذر کی وجہ سے حج کے لیے نہ جاسکے، ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے کہ وہ اپنی جگہ رہتے ہوئے بھی اعمال حج اور حجاج کرام سے نسبت پیدا کریں اور ان کے ساتھ اعمال حج میں شریک ہوجائیں قربانی میں بھی یہی حکمت پوشیدہ ہے، حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ذی الحجہ کا پہلا عشرہ شروع ہوجائے اور تم میں سے کسی کا ارادہ قربانی کرنے کا ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ قربانی کرنے تک نہ بال کٹوائے اور نہ ناخن ترشوائے (مسلم: ۱۵۶۳/۳، رقم الحدیث: 1977) تاہم یہ ممانعت تنزیہی ہے اس لیے بال وغیرہ نہ کٹوانا مستحب ہے اور اس حکم پر عمل نہ کرنا خلاف اولیٰ ہے قربانی کرنے والے شخص کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ قربانی کے بعد بال کٹوائے اور ناخن تراشے تاہم جو شخص قربانی کا ارادہ نہ رکھتا ہو اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ۲۰۰/۵) اس میں ایک مصلحت تو یہی ہے کہ حجاج کرام سے ایک گونہ مشابہت پیدا ہوجاتی ہے ایک اور حکمت اس عمل میں یہ پوشیدہ ہے کہ اصل میں قربانی کرنے والا اپنی جان کے عوض قربانی کرتا ہے اور قربانی کے جانور کا ہر جزو قربانی کرنے والے کے جسم کے ہر جزو کا بدلہ ہے، جسم کا کوئی جزو نزول رحمت کے وقت غائب ہوکر قربانی کی فضیلت سے محروم نہ رہے۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۸۸/۲)

ایام تشریق اور تکبیر تشریق:

ذی الحجہ کی نو تاریخ سے تیرہ تاریخ کی عصر تک ایام تشریق کہلاتے ہیں، ان ایام میں ہر فرض کے بعد تکبیر تشریق پڑھنا واجب ہے، خواہ نماز پڑھنے والا باجماعت نماز پڑھ رہا ہو یا تنہا، شہری ہو یا دیہاتی، مقیم ہو یا مسافر، مرد ہو یا عورت (الرد المحتار علی

الدر المختار: ۶۴/۳) سلام پھیرنے کے فوراً بعد تکبیر تشریق کہنی چاہئے اگر نماز کے بعد بھول گیا اور یاد آنے تک کوئی ایسی چیز مثلاً بات چیت وغیرہ نہیں پائی گئی جس سے نماز کی بنا ممنوع ہوجاتی ہے تو فوراً تکبیر کہہ لینی چاہئے، لیکن اگر بات چیت میں مشغول ہوگیا، یا جان بوجھ کر وضو توڑ ڈالی تو اب تکبیر نہیں کہی جائے گی، تاہم ترک واجب کے گناہ کی تلافی کے لیے توبہ واستغفار کرنا چاہئے۔ (فتاویٰ عالمگیری: ۱۵۲/۱) اگر کوئی شخص درمیان میں آکر جماعت کے اندر شریک ہو تو وہ اپنی نماز پوری کرنے کے بعد تکبیر کہے، یہ تکبیر بلند آواز سے کہی جائے گی، لیکن عورت زور سے نہ کہے (الرد المختار: ۶۴/۳) عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد تکبیر تشریق پڑھی جائے گی (البحر الرائق: ۱۶۵/۲) ایام تشریق میں اگر کوئی نماز فوت ہوجائے تو اس کی قضاء کے بعد تکبیر تشریق کہنا بھی واجب ہے (البحر الرائق: ۱۶۵/۲) تکبیر تشریق صرف ایک مرتبہ کہی جائے گی اس سے زیادہ کہنا خلاف سنت ہے (مجمع الانہر: ۱۷۶/۱) اس تکبیر کی اس قدر فضیلت ہے کہ عید الاضحیٰ کی نماز کے بعد دیا جانے والا خطبہ بھی اس سے شروع کرنا مستحب قرار دیا گیا ہے، البتہ خطبہ اولیٰ کے شروع میں مسلسل نو مرتبہ اللہ اکبر کہے اور دوسرے خطبے کے شروع میں سات مرتبہ کہے اور خطبہ ختم کرنے سے پہلے چودہ مرتبہ اللہ اکبر کہے (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ۲۹۴)

تکبیر تشریق کے الفاظ یہ ہیں: اللّٰہ اکبر، اللّٰہ اکبر لا الٰہ إلا اللّٰہ واللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد۔ اس تکبیر کی مشروعیت کے پیچھے بھی ذبح اسماعیل کا واقعہ ہے، جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے لخت جگر کو ذبح کرنے کے لیے چھری چلا رہے تھے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام جنت سے ایک مینڈھا لے کر اترے، انہیں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں چھری نہ چل جائے اس لیے انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو متوجہ کرنے کے لیے بلند آواز سے اللہ اکبر، اللہ اکبر، کہا حضرت

ابراہیم نے یہ آواز سنی تو بلند آواز سے فرمایا: **لا الہ إلا اللّٰہ واللّٰہ اکبر** اور جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ پتہ چلا کہ ان کے بجائے مینڈھے کی قربانی ہوگی تو فرمایا: **اللّٰہ اکبر وللّٰہ الحمد**۔ چنانچہ ان تینوں حضرات کے کہے ہوئے کلمات کے مجموعے کو تکبیر تشریق کا نام دے دیا گیا اور اس تکبیر تشریق کو ۲۳ نمازوں کے بعد واجب قرار دے دیا گیا۔ (فتاوی رحیمیہ :۸۹/۲)

عیدالاضحیٰ کے دن کیا کریں:

عیدالاضحیٰ کے دن دو عمل واجب ہیں (۱) عید کی نماز: (دیہات میں عید کی نماز نہیں ہے اس لیے دیہی باشندوں پر عید کی نماز واجب نہیں ہوگی) (۲) قربانی: اس کے لیے بھی صاحب نصاب ہونا ضروری ہے، اس دن کچھ اعمال مسنون ہیں اور وہ یہ ہیں (۱) صبح کو بہت سویرے بیدار ہونا (۲) غسل کرنا (۳) مسواک کرنا (۴) عمدہ کپڑے پہننا (۵) خوشبو لگانا (۶) شریعت کی مقرر کردہ حدود میں رہتے ہوئے زیب وزینت اختیار کرنا (۷) عیدالاضحیٰ کی نماز سے پہلے کچھ نہ کھانا (۸) عیدگاہ جاتے ہوئے راستے میں بلند آواز سے تکبیر تشریق کہنا، (۹) عیدگاہ پیدل جانا (۱۰) ایک راستے سے جانا اور دوسرے راستے سے واپس آنا (۱۱) بہت سویرے عیدگاہ پہنچنا (۱۲) عید کی نماز عیدگاہ میں جا کر پڑھنا، ہاں اگر کوئی عذر ہو تو شہر کی مسجدوں میں نماز عید پڑھی جاسکتی ہے (۱۳) عیدالاضحیٰ کی نماز جلدی پڑھنا (بہشتی زیور: ۸۵/۱)

قربانی کا نصاب:

جس طرح زکوۃ کا نصاب ہے اسی طرح قربانی کا بھی نصاب ہے، یعنی اگر کوئی شخص شریعت کی طرف سے مقرر کردہ نصاب کا مالک ہوگا تو اس پر قربانی واجب ہوگی ورنہ نہیں ہوگی، قربانی کا نصاب وہی ہے جو صدقۂ فطر کا ہے، یعنی ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی قیمت کی کوئی بھی دوسری چیز خواہ وہ تجارت کا

سامان ہو یا حاجتِ اصلیہ (زندگی گزارنے کے ضروری سامان) سے زائد ہو، موجودہ تول میں ساڑھے سات تولہ سونا ۸۷/۸ گرام ۴۸۰ ملی گرام ہوتا ہے اور ساڑھے باون تولہ چاندی موجودہ وزن میں ۶۱۲ گرام ۳۶۰ ملی گرام ہوتی ہے، اس نصاب پر سال کا گزرنا بھی شرط نہیں ہے، اگر کوئی شخص قربانی کے تین دنوں میں سے کسی بھی دن اس نصاب کا مالک بن گیا تو اس پر قربانی واجب ہوگی (فتاوی عالمگیری ۲۹۲/۵) نصاب میں سونا یا چاندی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ سونے چاندی کے زیورات کا بھی یہی حکم ہے، کسی شخص کے پاس سونا چاندی یا سونے چاندی کے زیورات نہیں ہیں لیکن اتنی رقم موجود ہے جس سے ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جاسکتی ہے تو وہ صاحب نصاب ہوگا، اسی طرح اگر اس کے پاس نہ سونا چاندی ہے نہ چاندی کے زیورات ہیں نہ نقد رقم ہے بلکہ ضرورت سے زائد گھریلو سامان ہے، مثلاً روزمرہ کے استعمال سے زیادہ قیمتی برتن یا آرائش کا ساز و سامان ہے، یا رہائشی مکان کے علاوہ بھی کوئی مکان یا جائے داد ہے خواہ وہ کرائے پر ہو یا خالی پڑی ہوئی ہو اس کے مالک پر بھی قربانی واجب ہے بڑی بڑی دیگیں، قالین، شامیانے، آرائشی پردے، ٹیلی ویژن، وی سی آر، ٹیپ ریکارڈر کیمرے وغیرہ، ضروری سامان میں داخل نہیں ہیں، البتہ پیشہ ور لوگوں کے اوزار سامان ضرورت میں داخل ہیں، سواری کے جانور یا دوسری سواریاں بھی ضرورت میں شمار کی جائیں گی، اہل علم کے لئے کتابیں ضرورت اصلیہ میں داخل ہیں (طحطاوی علی مراقی الفلاح: ص ۴۱۷)

زکوۃ اور قربانی کے نصاب میں فرق:

زکوۃ اور قربانی کے نصاب میں کچھ فرق ہے اس کو ذہن میں رکھنا چاہئے، ایک فرق تو یہ ہے کہ زکوۃ کے نصاب پر سال گزرنا ضروری ہے، اس کے بغیر زکوۃ فرض نہیں ہے، جب کہ قربانی کے نصاب پر سال کا گزرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اگر کوئی شخص

قربانی کے تین دنوں میں سے کسی دن بھی نصاب کا مالک ہوگیا اس پر قربانی ضروری ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ زکوۃ کی فرضیت کے لئے مال کا نامی ہونا ضروری ہے یعنی وہ مال بڑھنے والا ہو، جیسے مال تجارت، سونا چاندی وغیرہ، مگر قربانی کے لئے مال کا نامی ہونا ضروری نہیں ہے، بس ضرورت سے زائد ہونا کافی ہے، مثال کے طور پر ایک شخص کے پاس ضرورت سے زائد کچھ سامان ہے اور اس کی قیمت ساڑھے سات تولہ سونے یا ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر ہے تو اس پر قربانی ہوگی، زکوۃ نہیں ہوگی چاہے ایک سال کی مدت بھی گزر گئی ہو (ہدایہ :۱/ ۱۸۸، خلاصۃ الفتاوی ۴/ ۳۰۹)

قربانی واجب ہونے کی شرطیں:

قربانی واجب ہونے کے لئے ضروری ہے کہ قربانی کرنے والا (۱) مسلمان ہو، (۲) مقیم ہو (۳) آزاد ہو، (۴) بالغ ہو، (۵) صحیح العقل ہو، (۶) صاحب نصاب ہو، اس آخری شرط کی کچھ وضاحت گزر چکی ہے، باقی شرائط کی تفصیل یہ ہے کہ شریعت کے احکام کے مکلف صرف مسلمان ہیں، غیر مسلم شریعت کے کسی حکم کے نہ پابند ہیں نہ مکلف، مسافر پر قربانی واجب نہیں ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص شرعی ضابطے کے مطابق قربانی کے دنوں میں اپنے وطن سے دور اڑتالیس میل یا اس سے زائد فاصلے پر ہو تو اسے مسافر سمجھا جائے گا، اور اس پر قربانی واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر وہ قربانی کے آخری دن بارھویں ذی الحجہ کو سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے اپنے وطن واپس آگیا تو اس پر قربانی واجب ہوگی۔ غلام پر بھی قربانی نہیں ہے، اسی طرح نابالغ بچوں پر بھی قربانی واجب نہیں ہے، کیوں کہ شریعت نے عبادات کا مکلف بالغوں کو قرار دیا ہے، چنانچہ نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ، عبادات نابالغوں پر فرض نہیں ہیں، یہی حال قربانی کا بھی ہے، کیوں کہ قربانی بھی ایک عبادت ہے، البتہ صاحب حیثیت والدین یا اولیاء چھوٹے بچوں کی طرف سے (اگر وہ صاحب نصاب ہوں) قربانی کردیں تو

بہتر ہے ضروری نہیں ہے، اسی طرح پاگل اور دیوانے بھی احکام شرعیہ کے مکلف نہیں ہیں، اس لئے ایسے لوگوں پر بھی قربانی واجب نہیں ہوگی (فتاوی عالمگیری ۵/ ۲۹۲ الفقہ الاسلامی وادلتہ ۴/ ۲۷۱۱، احسن الفتاوی ۷/ ۴۹۸، بدائع الصنائع ۴/ ۱۹۷)

عورت پر قربانی واجب ہے:

مردوں کی طرح عورتوں پر بھی قربانی واجب ہے، اگر کوئی عورت صاحب نصاب ہے، خواہ زیورات اس کی ملکیت میں ہوں یا نقد روپیہ، یا ضرورت سے زائد سامان، ایسی عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ قربانی کرے، البتہ اگر اس کے پاس ایسے زیورات ہوں جو شوہر یا اہل خاندان کی طرف سے صرف پہننے کے لئے ملے ہوں تو اس پر قربانی واجب نہیں ہے، (فتاوی شامی ۹۵/ ۴۵۳) صاحب نصاب عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود قربانی کرے، شوہر پر بیوی کی طرف سے قربانی کرنا واجب نہیں ہے، البتہ اگر شوہر اپنی مرضی سے بیوی کی طرف سے قربانی کردے تو قربانی ادا ہوجائے گی (فتاوی عالمگیری: ۵/ ۲۹۳، امداد الفتاوی: ۳/ ۶۱۰)

گھر کے تمام صاحب نصاب افراد پر قربانی واجب ہے:

گھر میں اگر کئی افراد صاحب نصاب ہوں تو سب لوگ اپنی اپنی طرف سے قربانی کریں، ایک قربانی تمام افراد کی طرف سے کافی نہ ہوگی، اگر سب کی طرف سے ایک بکرا کردیا گیا، یا دو تین حصے بڑے جانور کے کردئے گئے اور مخصوص افراد کی نیت نہیں کی تو قربانی کسی کی طرف سے بھی ادا نہیں ہوگی، (مجمع الانہر: ۲/ ۵۱۶) اگر باپ بیٹے کسی کاروبار میں شریک ہوں اور دونوں صاحب نصاب ہوں تو دونوں پر قربانی ہوگی، البتہ اگر کاروبار میں بیٹے کا حصہ متعین نہ ہو اور نہ اس کے پاس اتنا مال ہو کہ اسے صاحب نصاب کہا جاسکے اس پر قربانی نہیں ہے، صرف باپ پر قربانی واجب ہوگی، اسی طرح اگر چند بھائی ایک کاروبار میں شریک ہیں اور ان کا

مال مشترک ہے، اگر انفرادی طور پر ہر ایک کا حصہ بہ قدر نصاب ہو تو سب پر قربانی ہے اور اگر انفرادی طور پر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بہ قدر نہ ہو تو کسی پر قربانی واجب نہیں ہے۔ (فتاوی شامی: ۹/ ۴۵۷)

قربانی ہر سال واجب ہے:

قربانی ہر سال واجب ہے، جس طرح زکوۃ ادا کرنا ہر سال ضروری ہوتا ہے، یا صدقۃ الفطر ہر سال ادا کیا جاتا ہے اسی طرح قربانی بھی ہر سال ادا کی جائے گی بہ شرطیکہ کوئی شخص ہر سال قربانی کے ایام میں صاحب نصاب رہتا ہو، (مجمع الانہر: ۲/ ۵۱۶) ہاں اگر کوئی شخص قربانی کے ایام سے پہلے ہی صاحب نصاب نہ رہا یا قربانی کے ابتدائی ایام میں صاحب نصاب تھا لیکن ابھی قربانی کی بھی نہیں تھی کہ غریب ہو گیا تو اب اس پر قربانی نہیں ہے۔ (بدائع الصنائع: ۴/ ۱۹۸)

مقروض پر قربانی نہیں:

اگر کسی کے پاس بہ قدر نصاب مال ہے، مگر اس کے ذمے اتنا قرض بھی ہے کہ اگر وہ قرض ادا کر دیتا ہے تو صاحب نصاب نہیں رہتا ایسی صورت میں اس پر قربانی نہیں ہے (فتاوی عالمگیری: ۵/ ۲۹۳) جو شخص مقروض ہو اس کو پہلے قرض ادا کرنا چاہئے، قربانی نہ کرے (امداد المفتین: ۲/ ۶۹۱) اسی طرح قرض لے کر قربانی کرنا بھی بہتر نہیں ہے اگر واجب نہ ہو لیکن اگر قرض لے کر قربانی کر لی گئی تو قربانی ہو جائے گی (کفایۃ المفتی: ۸/ ۲۰۷)

قرض خواہ پر قربانی:

اگر کسی شخص نے قرض پر رقم دے رکھی ہے، اور وہ رقم نصاب کے برابر ہے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ قرض کی واپسی کا امکان غالب ہے یا نہیں، اگر گمان غالب ہے کہ یہ رقم واپس مل جائے گی تو قربانی واجب ہے، ورنہ واجب نہیں ہے۔ (فتاوی عالمگیری: ۵/ ۳۰۷)

مال حرام رکھنے والے پر قربانی:

اگر کسی شخص کے پاس حرام مال ہے، مثلاً وہ مال چوری، رشوت یا دھوکے وغیرہ سے حاصل کیا ہوا ہے تو ایسے مال والے پر قربانی نہیں ہے، بلکہ تمام مال کا صاحب مال کو واپس کرنا ضروری ہے اور اگر صاحب مال متعین نہیں ہے یا موجود نہیں ہے تو تمام مال کا بلا نیت ثواب صدقہ کرنا واجب ہے۔ (احسن الفتاوی: ۷/ ۵۰۷)

غریب پر قربانی کب واجب ہوگی:

غریب پر قربانی واجب نہیں ہے، لیکن اگر کسی غریب شخص نے قربانی کے دنوں میں قربانی کی نیت سے کوئی جانور خرید لیا تو اب اس جانور کی قربانی ضروری ہوگی، نہ اسے بیچنے کی اجازت ہے اور نہ بدلنے کی۔ (بدائع الصنائع: ۴/ ۱۹۲)

ایک شخص پر ایک قربانی واجب ہے:

ایک شخص پر ایک ہی قربانی واجب ہے خواہ وہ کتنا ہی مال و دولت کیوں نہ رکھتا ہو، اور خواہ اس کی ملک میں کتنے ہی نصاب کیوں نہ جمع ہو جائیں، البتہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد قربانی کرتا ہے تو تمام قربانیاں ادا ہوں گی اور اگر خلوص دل کے ساتھ بہ نیت ثواب ہوں گی تو ان شاء اللہ ان تمام قربانیوں پر اجر بھی ملے گا (امداد الفتاوی: ۳/ ۵۵۳)

مُردوں کی طرف سے قربانی:

قربانی مُردوں کی طرف سے بھی کی جاسکتی ہے، بلکہ اگر گنجائش ہو تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، بزرگان دین، مشائخ کرام، اپنے والدین اور عزیز و اقارب کی طرف سے قربانی کرے تو اس کا بڑا اجر و ثواب ہے مرحوم افراد کے لئے الگ الگ قربانی بھی کی جاسکتی ہے، یا ایک قربانی کا ثواب تمام مرحوم افراد کو بھی بخشا جاسکتا ہے، میت کے لئے کی گئی قربانی کا گوشت امیر و غریب سب کے لئے کھانا جائز ہے۔ (فتاوی شامی: ۵/ ۲۱۴)

قربانی کے دنوں میں قربانی نہ کرسکے تو کیا حکم ہے:

اگر کسی شخص نے قربانی کے دنوں میں قربانی نہیں کی، خواہ غفلت سے یا ناواقفیت اور جہالت کے باعث، ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ توبہ واستغفار کرے اور گزشتہ تمام برسوں کی ہر قربانی کا حساب لگا کر نہایت اہتمام کے ساتھ قربانی کے جانور کی قیمت صدقہ کر دے (خلاصۃ الفتاوی: ۴/ ۳۱۱)

کن جانوروں کی قربانی جائز ہے:

بکرا، بکری، بھیڑ، دنبہ، بیل، بھینس، جھوٹا کٹڑا، گائے، اونٹ اور اونٹنی کی قربانی شرعاً درست ہے، باقی جانوروں کی قربانی درست نہیں ہے، قربانی کے جانور کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ جنگلی اور وحشی نہ ہوں، اسی لئے ہرن اور نیل گائے کی قربانی درست نہیں ہے، خواہ گھروں میں پلی ہوں (بدائع الصنائع: ۴/ ۲۰۵) بانجھ جانور کی قربانی درست ہے، اسی طرح اگر کوئی جانور خصی کر دیا گیا ہو تو اس کی قربانی بھی درست ہے، حاملہ جانور کی قربانی بھی درست ہے، لیکن اگر حمل کا وقت پورا ہو چکا ہو تو ایسے جانور کو ذبح نہ کیا جائے، تاہم اگر اس کی قربانی کر لی اور بچہ زندہ نکلا تو اسے بھی ذبح کیا جائے گا، اس کا گوشت کھانا بھی درست ہے، لیکن اگر بچہ مردہ ہو تو وہ حرام ہے (فتاوی عالمگیری: ۵/ ۲۹۹، مجمع الانہر: ۲/ ۵۱۹، بدائع الصنائع: ۴/ ۱۵۹)

کن جانوروں کی قربانی درست نہیں:

چوری کئے ہوئے جانور کی قربانی درست نہیں ہے، جس بکری میں نر اور مادہ دونوں کی علامتیں موجود نہ ہوں یا دونوں کی علامتیں موجود ہوں وہ خنثیٰ ہے اس کی قربانی جائز نہیں ہے، جس جانور کے سینگ جڑ سے اکھڑ گئے ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں اور چوٹ کا اثر دماغ تک پہنچ گیا ہو تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہے، البتہ جس جانور کے سینگ پیدائش سے نہ ہوں یا ٹوٹ گئے ہوں یا ان کا خول اتر گیا ہو اس کی

قربانی درست ہے، اسی طرح اگر کسی جانور کے کان پیدائشی طور پر نہ ہوں، خواہ ایک کان یا دونوں، یا ایک کان یا دونوں کان مکمل طور پر کٹ گئے ہوں یا تہائی کٹ گئے ہوں تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، البتہ اگر کسی جانور کے کان پیدائشی طور پر چھوٹے ہوں تو اس کی قربانی صحیح ہے، اسی طرح اگر کسی جانور کا کان تہائی سے کم کٹا ہوا ہو تو جائز ہے، اگر کسی جانور کے دونوں کان اتنے کٹے ہوں کہ الگ الگ تو تہائی سے کم ہوں لیکن دونوں کانوں کا مجموعی کٹا ہوا حصہ تہائی سے زیادہ ہو تو ایسے جانور کی قربانی خلاف احتیاط ہے تاہم قربانی ہو جائے گی، اگر کسی جانور کے دانت بالکل گر گئے ہوں یا اکثر دانت گر گئے ہوں تو اس کی قربانی جائز نہیں ہے، لیکن اگر وہ اس حالت میں بھی گھانس چر لیتا ہو تو قربانی جائز ہے، اگر کسی جانور کی دم تہائی یا اس سے زیادہ کٹی ہوئی ہو تو ایسے جانور کی قربانی بھی جائز نہیں ہے، اگر کوئی جانور اس قدر لنگڑا ہے کہ صرف تین پیر سے چلتا ہو اور چوتھا پیر زمین پر نہ رکھ پاتا ہو تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہے، لیکن اگر چوتھا پیر زمین پر رکھ لیتا ہے مگر لنگڑا کر چلتا ہے تو اس کی قربانی درست ہے، گائے کے دو تھن اور بکری کا ایک تھن خراب ہو تو اس کی قربانی درست نہیں ہے، قربانی کا جانور جتنا موٹا اور فربہ ہو اتنا ہی اچھا ہے جانور کے جسم پر بال ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تمام عیوب اگر جانور خریدنے کے بعد پیدا ہوئے تو ان لوگوں کو جن پر قربانی واجب ہے دوسرا جانور خرید کر قربانی کرنی چاہئے، اور جن پر قربانی واجب نہیں تھی محض نفلی قربانی کی غرض سے انھوں نے جانور خریدا تھا، ایسے لوگوں کو وہی جانور قربان کر دینا چاہئے، اور اگر یہ عیوب عین ذبح کے وقت پیدا ہوئے تب کوئی حرج نہیں، قربانی درست ہے، (مجمع الانہر: ۲/ ۵۱۹، بدائع الصنائع: ۴/ ۲۱۴، عالمگیری: ۵/ ۲۹۹، امداد الفتاوی: ۳/ ۵۹۷ ہدایہ: ۴/ ۴۴۷)

قربانی کے جانور کی عمریں:

قربانی میں جن جانوروں کو ذبح کرنے کی اجازت ہے شریعت میں ان کی عمریں متعین ہیں، بکرا بکری ایک سال کا ہونا ضروری ہے، بیل، بھینس کٹرا دو سال کا ہونا چاہئے اور اونٹنی یا اونٹ کی عمر پانچ سال کی ہونا ضروری ہے، اس سے کم عمر کے جانور کی قربانی درست نہیں ہے، البتہ اگر بھیڑ دنبہ چھ ماہ سے زیادہ کے ہوں اور دیکھنے میں اتنے موٹے ہوں کہ ایک سال کے معلوم ہوتے ہوں تو ان کی قربانی درست ہے مگر چھ ماہ سے کم عمر کا دنبہ یا بھیڑ بھی درست نہیں ہے، (فتاوی شامی: ۹/ ۴۶۵ البحر الرائق: ۸/ ۱۷۷) کیوں کہ اکثر حالات میں جانوروں کی عمریں صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتیں اس لئے دانتوں کی علامت مقرر کردی گئی ہے کہ اگر یہ جانور دو دانت یا دو سے زائد کے ہوں تو مطلوبہ عمر کا سمجھا جائے گا البتہ اگر کسی جانور کے دانت نہ نکلے ہوں اور مالک کو اس کی صحیح عمر معلوم ہو تب اس کی قربانی درست ہے (کفایۃ المفتی: ۸/ ۲۱۸)

جانوروں میں کتنے حصے ہیں؟:

گائے، بیل، بھینس، جھوٹا، کٹرا اور اونٹ اور اونٹنی بڑے جانور ہیں، ان میں سات افراد شریک ہو سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ کسی کا حصہ بھی ساتویں حصے سے کم نہ ہو اور سب کی نیت قربانی کرنے یا عقیقہ کرنے کی ہو، محض گوشت کھانے کی نیت سے حصہ نہ کر رہا ہو، اگر پانچ، چھ یا چار یا اس سے بھی کم افراد شریک ہوں تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، اگر تنہا ایک شخص پورے جانور کی قربانی کرے تب بھی درست ہے، لیکن سات سے زیادہ افراد کی شرکت درست نہ ہوگی، اگر کسی جانور میں آٹھ افراد یا ان سے زیادہ افراد شریک ہو گئے تو کسی کی قربانی بھی درست نہ ہوگی (فتاوی عالمگیری: ۵/ ۲۲۵) بکرا بکری، دنبہ بھیڑ میں صرف ایک حصہ ہے، ایک ہی آدمی اپنی قربانی کر سکتا ہے۔

قربانی کا وقت:

ذی الحجہ کی دس تاریخ کی صبح سے بارہ ذی الحجہ کی شام سورج ڈوبنے تک قربانی کا وقت ہے، جس دن چاہے کرے، لیکن افضل دن پہلا دن ہے، پھر دوسرا اور تیسرا دن ہے۔ جس گاؤں میں نماز عید یا نماز جمعہ نہیں ہوتی اس گاؤں کے باشندے دس ذی الحجہ کو طلوع فجر کے بعد قربانی کر سکتے ہیں، لیکن جن بستیوں میں جمعہ یا عید کی نماز ہوتی ہے، وہاں کے باشندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ نماز عید کے بعد قربانی کریں، اس سے پہلے قربانی کرنا درست نہیں ہے، اگر کسی نے نماز عید سے پہلے قربانی کر دی تو اس پر دوبارہ قربانی کرنا ضروری ہے، کسی شہر میں متعدد جگہوں پر نماز عید پڑھی جاتی ہو تو کسی ایک جگہ نماز عید پڑھ لینے کے بعد پورے شہر میں قربانی کی جا سکتی ہے لیکن اگر کسی وجہ سے دس ذی الحجہ کو نماز عید نہ پڑھی جا سکے تو زوال کا وقت گزرنے کے بعد قربانی کر لی جائے گی، کیونکہ عید کی نماز کا وقت زوال تک ہے، البتہ بارہ اور تیرہ تاریخ کو جب چاہے قربانی کر سکتا ہے، اگرچہ عید کی نماز بارہ یا تیرہ تاریخ کو ادا کی جائے رات میں فی نفسہ قربانی کرنا مکروہ نہیں ہے لیکن کیوں کہ تاریکی کی وجہ سے غلط رگ کٹنے کا امکان ہے اس لئے منع کیا گیا ہے، اگر روشنی کا معقول انتظام ہو اور غلطی کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو گیارہ اور بارہ تاریخ کی راتوں میں بھی قربانی کی جا سکتی ہے (فتاوی شامی: ۹/ ۴۶۰، فتاوی عالمگیری: ۵/ ۲۹۵، البحر الرائق: ۸/ ۳۲۲)

قربانی کے آداب:

قربانی ایک بہترین عبادت ہے، اور انبیائے کرام کی سنت ہے، بالخصوص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس عبادت کی ادائیگی اس کے تمام آداب کی رعایت کے ساتھ کریں۔

قربانی کے وقت مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہئے۔(۱) جانور کو ذبح کرنے سے پہلے گھانس وغیرہ کھلائے اور پانی پلائے،(۲) ذبح کے لئے جانور کو گھسیٹ کر نہ لے جائے، ایسا کرنا مکروہ ہے،(۳) جس قدر ممکن ہو آسانی کے ساتھ زمیں پر گرائے، غیر ضروری سختی کرنا مارنا پیٹنا مکروہ ہے،(۴) بائیں کروٹ پر قبلہ رخ لٹائے، جنوب کی طرف سر ہو تو بہتر ہے، اس سے گردن پر چھری پھیرنے والے کو سہولت ہوتی ہے، قبلہ کی طرف نہ لٹانا مکروہ ہے (۵) چار پیروں میں سے تین باندھے،(۶) چھری تیز کرے، کند یا کم دھار والی چھری سے ذبح کی کوشش کرنا مکروہ ہے،(۷) چھری ایک طرف ہو کر تیز کی جائے، جانور کے سامنے چھری تیز کرنا مکروہ ہے،(۸) جانور کو ذبح کے لئے لے جانے سے یا لٹانے سے پہلے چھری تیز کرے ایک شخص نے جانور کو زمین پر گرا کر چھری تیز کی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ کیا تم جانور کو ایک سے زائد بار مارنا چاہتے ہو،(۹) ایک جانور کو دوسرے جانور کے سامنے ذبح کرنا مکروہ ہے،(۱۰) جانور کو لٹانے کے فوراً بعد ذبح کر دینا چاہئے، خواہ مخواہ کی تاخیر کرنا مکروہ ہے،(۱۱) اس قدر سخت ہاتھ سے اندر تک چھری نہ چلائے کہ سر الگ ہو جائے، یا حرام مغز تک چھری اتر جائے، یہ عمل بھی مکروہ ہے (۱۲) گردن کے اوپر سے ذبح کرنا مکروہ وممنوع ہے،(۱۳) ذبح کے بعد جب تک جانور ٹھنڈا نہ ہو جائے اس وقت تک نہ گردن الگ کرے اور نہ کھال اتارے یہ بھی مکروہ ہے (فتاوی شامی:۹/ ۴۲۶،فتاوی عالمگیری:۵/ ۲۸۸،بدائع الصنائع:۴/ ۱۸۰)

قربانی کی دُعا:

جانور ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھ لینی چاہئے، اگر کسی نے جان بوجھ کر بسم اللہ نہیں پڑھی تو وہ جانور حلال نہیں ہے بلکہ مردار ہے، اس کا کھانا حرام ہے اگر بھول سے بسم اللہ نہیں پڑھی تو ذبیحہ حلال ہے،(امداد الفتاوی:۲/ ۵۵۸) خدا

توفیق دے تو یہ دعا یاد کر لینی چاہئے اور قربانی کے وقت پڑھ لینی چاہئے، اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضَ عَلٰی مِلَّةِ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ، اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، لَاشَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ، اَللّٰهُمَّ مِنْکَ وَلَکَ، پھر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کر دے، ذبح کرنے کے بعد یہ دُعا پڑھے: اَللّٰهُمَّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ کَمَا تَقَبَّلْتَ مِنْ حَبِیْبِکَ مُحَمَّدٍ، وَخَلِیْلِکَ اِبْرَاهِیْمَ عَلَیْهِمَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام. (ابوداؤد:۲/ ۳۸۶)، اگر قربانی دوسرے کی طرف سے کرنی ہو تو "مِنِّیْ" کی جگہ "مِنْ" کہہ کر اس شخص کا نام لے جس کی قربانی ہے۔

قربانی کے گوشت کا حکم:

قربانی کا گوشت خود قربانی کرنے والا بھی کھا سکتا ہے دوسرے مال دار کو بھی کھلا سکتا ہے، بہتر یہ ہے کہ گوشت کا ایک تہائی حصہ صدقہ کر دیا جائے، ایک تہائی حصہ عزیز واقارب کو ہدیہ کر دیا جائے، اور باقی گھر میں رکھ لیا جائے، لیکن اگر اہل وعیال کی کثرت یا کسی دوسری وجہ سے قربانی کا تمام گوشت خود ہی رکھ لیا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے،(فتاوی شامی:۹/ ۴۷۳،فتاوی عالمگیری:۵/ ۳۰۰) قربانی کا گوشت غیر مسلم کو دینا بھی جائز ہے،(امداد الفتاوی:۳/ ۵۵۰، احسن الفتاوی:۷/ ۴۹۶) قربانی کرنے والے کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ عید الاضحیٰ کے دن اپنے کھانے کا آغاز قربانی کے گوشت سے کرے (احسن الفتاوی:۷/ ۵۲۱)

گوشت کی تقسیم کس طرح کی جائے:

اگر گھر کے افراد (مثلاً بہن بھائیوں اور والدین نے) ایک بڑے جانور میں حصے کئے ہیں اور قربانی مشترک ہے تو اس صورت میں گوشت کی تقسیم ضروری نہیں ہے، جس طرح چاہے استعمال کریں (فتاوی شامی:۹/ ۴۶۰) البتہ کسی بڑے جانور

(مثلاً بیل بھینس واونٹ وغیرہ) میں کئی افراد شریک ہوں تو گوشت اندازے سے تقسیم نہ کریں، بلکہ ٹھیک ٹھیک تول کر تقسیم کریں، اگر کسی کے حصے میں زیادہ گوشت چلا گیا تو وہ سود کے حکم میں ہوگا، اور گناہ کا سبب بنے گا البتہ اگر کسی شریک کے حصے میں سری پائے زیادہ کردیے جائیں اور کچھ گوشت کم کرلیا جائے اور جو گوشت کم کیا جائے وہ باقی شرکاء پر برابر برابر تقسیم کردیا جائے تو کوئی حرج نہیں، البتہ اگر تمام شریک حصہ دار اس بات پر متفق ہوں کہ گوشت تقسیم نہ کیا جائے بلکہ ایک ہی جگہ پکا کر کھایا جائے یا تقسیم کیا جائے یا کسی کو دیدیا جائے، یا صدقہ کردیا جائے تو یہ جائز ہے لیکن اگر کوئی ایک فریق بھی اس کے خلاف ہو اور وہ اپنا حصہ الگ لینا چاہتا ہو تو تقسیم کرنا ضروری ہے۔(بدائع الصنائع:۴/۲۰۱)

قربانی کی کھال کا مصرف:

قربانی کے جانور کی کھال کا حکم یہ ہے کہ قربانی کرنے والا اسے خود بھی استعمال کرسکتا ہے، مال داروں کو ہدیہ بھی دے سکتا ہے، اور غریبوں پر صدقہ بھی کرسکتا ہے، لیکن اگر کسی نے کھال فروخت کردی تو اب اس کی قیمت صدقہ کرنا واجب ہے خواہ کسی بھی نیت سے فروخت کی ہو، (فتاوی شامی:۹/۴۷۵) کھال کی قیمت کا مصرف وہی ہے جو زکوۃ کا مصرف ہے، زکوۃ کے بارے میں تصریح موجود ہے کہ مستحقین کو مالک بنانا ضروری ہے، مساجد کی تعمیر میں اس کی رقم استعمال کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح مدارس کی تعمیر یا مدارس کے ملازمین اور مدرسین کی تنخواہوں میں بھی اس رقم کا استعمال تملیک کے بغیر جائز نہیں ہے، البتہ مدارس کے غریب اور نادار طلبہ کو یہ رقم دی جاسکتی ہے، بلکہ اس میں دوہرا اجر ہے، ایک تو غریبوں کی مدد دوسرے حصول علم کے لئے تعاون (فتاوی عالمگیری:۵/۳۰۱، مجمع الانہر:۴/۵۲۱) قربانی کے جانور کی کھال قصاب کو اجرت میں دینا بھی جائز نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی قربانی کی کھال فروخت کرے اس کی قربانی نہیں ہوئی، اس حدیث کا منشاء یہ ہے کہ کھال کو فروخت کرکے اس کی رقم اپنے استعمال میں لائے جیسا کہ قصاب کو بطور اجرت دینے کی صورت میں ہے، البتہ فروخت کرکے اس کی رقم صدقہ کرنے کا ارادہ ہو تو فروخت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(فتاوی شامی:۹/۴۷۵)

نماز عید کی نیت:

نیت دل کے ارادے کا نام ہے، اگر نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ خیال ہو کہ وہ فلاں نماز پڑھ رہا ہے تو کافی ہے، نماز عید الاضحیٰ کے وقت بھی دل میں یہ خیال رہنا چاہئے کہ وہ دو رکعت نماز واجب چھ زائد واجب تکبیروں کے ساتھ وہ بھی اس امام کی اقتداء میں نماز ادا کر رہا ہے تو کافی ہے، زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے، لیکن اگر زبان سے کہہ لے تو بہتر ہے۔(ہدایہ:۱/۸۰)

عید کی نماز کا مسنون طریقہ:

نیت کے بعد تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھ لے "سبحانک اللھم" آخر تک پڑھے، پھر دونوں کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ نیچے کی طرف چھوڑ دے، پھر دوسری بار اسی طرح ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ چھوڑ دے، پھر تیسری مرتبہ اسی طرح ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہے اور ہاتھ باندھ لے، اس کے بعد امام تعوذ وتسمیہ، سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پڑھے گا، مقتدی خاموش رہیں گے، یہ رکعت رکوع اور دو سجدوں کے ساتھ دوسری نمازوں کی طرح مکمل کی جائے گی، دوسری رکعت میں پہلے امام قرأت کرے گا، اس کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے تین زائد تکبیریں ہوں گی، ہر مرتبہ کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہا جائے گا اور ہاتھ چھوڑ دیے جائیں گے، چوتھی تکبیر میں ہاتھ نہیں اٹھائے جائیں گے بلکہ رکوع میں جائیں گے

باقی نماز اسی طرح پوری کی جائے گی جس طرح دوسری نمازیں پوری کی جاتی ہیں (غنیۃ المستملی:۴۸۸)

عید کا خطبہ:

نماز کے بعد امام خطبہ دے گا، عید کا خطبہ پڑھنا اور سننا سنت مؤکدہ ہے، اگر خطبہ پڑھا جائے اور کوئی شخص وہاں موجود ہو تو خطبہ سننا واجب ہے، اس وقت گفتگو کرنا یا شور مچانا سخت گناہ ہے، یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ خطبہ کی آواز کانوں تک پہنچے اگر خطبہ پڑھا جا رہا ہو تو خاموش رہنا واجب ہے، (امداد المفتیین:۸۷)

نماز عید کے بعد مصافحہ، معانقہ کرنا:

کسی مسلمان سے ملاقات کے وقت مصافحہ یا معانقہ کرنا مسنون ہے، لیکن نماز عید کے بعد لوگوں نے اس کو اس قدر ضروری سمجھ لیا ہے کہ سلام پھیرتے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے معانقے اور مصافحے شروع کر دیتے ہیں یہ طریقہ بدعت ہے، اس سے عیدگاہ میں افراتفری سی پھیل جاتی ہے، لوگ خطبہ سننے کے بجائے اس کام میں مشغول ہو جاتے ہیں، عید کے دن ایک دوسرے کو "تقبلَ اللّٰهُ مِنّا وَمِنکُمْ" اور عید مبارک جیسے کلمات کہہ کر مبارکباد دی جا سکتی ہے۔
(فتاوی شامی:۹/۷/۵۴۷، فتاوی رحیمیہ:۳/۲/۷، طحطاوی علی مراقی الفلاح:۲۸۹)

رمضان، قرآن اور ہماری زندگی

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کی ذات گرامی سے کون واقف نہیں، ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں یہ نام ان لوگوں کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ مادر وطن کو غیر ملکی استعماریت پسندوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کے لیے صرف کیا، اس مقصد کے لیے حضرت شیخ الہندؒ نے پیرانہ سالی میں قید وبند کی اذیتیں اور صعوبتیں بھی برداشت کیں، نہ انہیں ستائش کی تمنا تھی اور نہ صلے کی آرزو، محض رضائے الٰہی کی جستجو تھی، ایک دن جیل کی تنہائیوں میں کچھ آزردہ خاطر تھے، رفقاء نے تسلی کے لیے کچھ عرض کرنا چاہا، فرمایا اس تکلیف کا غم نہیں جو ایک دن ختم ہو جانے والی ہے، غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف ومحنت اللہ کے نزدیک مقبول بھی ہے یا نہیں؟۔

نام ونمود اور جاہ واقتدار کی طلب وخواہش سے دور محض اللہ کی خوشنودی اور رضا کے لیے تین سال تک مالٹا کی جیل میں قید وبند کی مشقتیں برداشت کرنے کے بعد جب دیوبند واپس تشریف لائے تو ایک دن اہل علم کی مجلس میں ارشاد فرمایا کہ "ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں، یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سالہ سینکڑوں علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق

سکھے ہیں وہ کیا ہیں، فرمایا کہ "میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں، تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"۔

(بہ حوالہ وحدت امت ص: ۳۹-۴۰)

یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع عثمانی دیوبندیؒ نے لکھا ہے کہ "آج مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث وآفات سے دوچار ہیں اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا، غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی۔ (حوالہ سابق)

یہ واقعہ ہے کہ مسلمان قرآن کریم سے بے پناہ محبت اور عقیدت رکھتا ہے اسے بوسہ دیتا ہے، سینے سے لگاتا ہے، سر پر رکھتا ہے، گلے میں اس کی آیات کے تعویذ بنا کر لٹکاتا ہے، پانی پر دم کرا کے پیتا ہے، اس کی قسمیں کھاتا ہے، یہ سب کچھ ہے، مگر اس پر عمل نہیں کرتا، اس کی آیات میں فکر وتدبر سے کام نہیں لیتا، صاف ظاہر ہے کہ قرآن کریم سے اس کی یہ محبت محض ظاہری ہے، حقیقی نہیں ہے، اگر حقیقی ہوتی تو اسے اپنے لیے نمونۂ عمل بناتا، اپنی پریشانیوں کا حل اس کی آیتوں میں تلاش کرتا، اپنے

مصائب کے اسباب اور ان کے تدارک کا طریقہ کار اس کے معانی میں ڈھونڈتا، اس وقت ساری دنیا کا مسلمان پریشان ہے، وہ ذلت ونکبت کی اندھیری وادیوں میں بھٹک رہا ہے، کوئی اس کی دست گیری کرنے والا نہیں ہے، تاریکیاں اس کا مقدر بن چکی ہیں، کیوں کہ وہ روشنیوں کے منبع اور ماخذ سے منحرف ہو کر چل رہا ہے، وہ ظلمتوں میں ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہے، اس لیے کہ اس نے نور سے روگردانی اختیار کر لی ہے اسے یہ معلوم نہیں کہ جو کتاب ہدایت اس کی رہ نمائی کے لیے نازل کی گئی اور جس میں اس کی مشکلات کا حل موجود ہے سراپا نور ہے، اسی نور کی روشنی میں نشان منزل تک پہنچا جا سکتا ہے، تیرہ وتار راستوں میں یہی نور اس کا ہادی اور رہ نما بن سکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

قَدْ جَآئَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ، يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ. (المائدة: ۱۵-۱۶)

ترجمہ: "تمہارے پاس اللہ کی طرف سے روشنی آ چکی ہے اور ایک کھلی کتاب جس کے ذریعے اللہ تعالی ان لوگوں کو جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں سلامتی کے طریقے بتلاتا ہے اور اپنی توفیق سے انہیں اندھیروں سے نکال کر اجالے کی طرف لاتا ہے اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہ نمائی کرتا ہے"۔

حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن کریم سے دوری اور بے اعتنائی کو مسلمانوں کے مصائب کی بنیاد قرار دیا اور مالٹا کی اسارت کے زمانے میں یہ طے کیا کہ وہ واپسی کے بعد مسلمانوں کو قرآن کریم کے قریب لانے کے لیے جد وجہد کریں گے، چناں چہ ضعف وعلالت اور ہجوم مشاغل کے باوجود انہوں نے بذات خود درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا

دیکھا جائے تو وہ یہ سبق تھا جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مسلمانوں کو اس وقت پڑھایا تھا جب ہندوستان میں ان کی سلطنت کا سورج غروب ہونے والا تھا حضرت شاہ صاحبؒ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان خدا کی کتاب سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کریں گے اور اسے مشعل راہ نہیں بنائیں گے اس وقت تک نہ مسلمانوں کے عقائد درست ہو سکتے ہیں اور نہ ان کے اعمال کی اصلاح ہو سکتی ہے، اسی لیے انہوں نے اپنے وصیت نامے میں مسلمانوں کو بہ طور خاص یہ تلقین کی کہ قرآن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا جائے، اس کا کچھ حصہ روزآنہ پڑھا جائے اور اس پر غور وفکر کیا جائے اور اس کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اگر پڑھنے کی صلاحیت نہ ہو تو اس کا ایک ورق ترجمے کے ساتھ سن لیا جائے۔ (المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ: ص ۵۰)

☆☆☆

تمت الخیر